سہ ماہی

علمی و تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

25

نمت

ادار یہ

مسلمانوں کے درمیان قرآن کی تنہائی

حروف مقطعات[1] مختلف آراء تجزیاتی مطالعہ

عقیدہ رجعت قرآن وحدیث کی روشنی میں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: امن وآشتی کے پیکر

گفتنی ہا

رضاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایتوں کا تحقیقی جائزہ

الٰہی اقتصادیات کے بنیادی اصول (۲)

حکومت کی ضرورت واہمیت (نہج البلاغہ کی روشنی میں)

فہم القرآن کی مشکلات اور خطرات

(نور الہدیٰ مرکز تحقیقات)

کلام الامام، امام الکلام

تقویٰ انسان کی پناہ گاہ اور زادِ راہ

أُوصِيكُمْ عِبَادَ اللهِ بِتَقْوَى اللهِ الَّتِي هِيَ الزَّادُ وَ بِهَا الْمَعَاذُ [الْمَعادُ]، زَاد مُبْلِغ [مُبَلِّغ] وَ مَعاذ مُنْجِح۔ دَعَا اِلَيْهَا أَسْمَعُ دَاعٍ، وَ وَعَاهَا خَيْرُ وَاعٍ؛فَأَسْمَعَ دَاعِيهَا، وَ فَازَ وَاعِيهَا۔ عِبَادَاللهِ! اِنَّ تَقْوى اللهِ حَمَتْ أَوْلِيَاءَ اللهِ مَحَارِمَهُ، وَ أَلْزَمَتْ قُلُوبَهُمْ مَخَافَتَهُ؛ حَتّىٰ أَسْهَرَتْ لَيَالِيَهُمْ، وَ أَظْمَأَتْ هَوَاجِرَهُمْ؛ فَأَخَذُوا الرَّاحَةَ بِالنَّصَبِ، وَ الرِّيَّ بِالظَّمَأ...

اللہ کے بندو! میں تمہیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں جو تمہارے لئے زادِ راہ ہے اور اسی پر آخرت کا دار و مدار ہے۔ یہی زادِ راہ منزل تک پہنچانے والا ہے اور یہی پناہگاہ کام آنے والی ہے۔اس کی طرف سے بہترین دعوت دینے والے نے دعوت دی ہے اور اسے سب سے بہتر سننے والے نے محفوظ کر لیا ہے۔ چنانچہ اس کے سنانے والے نے سنا دیا ہے اور اس کے محفوظ کرنے والے نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اللہ کے بندو! اسی تقویٰ الٰہی نے اولیاء خدا کو محرمات سے بچا لیا ہے۔اور ان کے دلوں میں خوفِ خدا کو لازم کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی راتیں بیداری کی نذر ہو گئیں اور ان کے یہ پتتے ہوئے دن پیاس میں گذر گئے۔انھوں نے راحت و آرام کو تکلیف کے عوض اور سیرابی کو پیاس کے ذریعہ حاصل کیا ہے ...

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱۱۴)

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لیے شائع کیا جارہا ہے۔ یہ جریدہ یونی ورسٹیوں اور دینی مدارس کے اساتذہ اور طلاب کا اپنا جریدہ ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا اور ان کے زور قلم کو مزید نکھارنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون اور ان کے قیمتی مشوروں کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شایع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گرانقدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ دے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لیے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں اس ترتیب سے لکھے جائیں: **کتاب کا نام؛ مصنف کا نام؛ پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔**
- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں '' نور معرفت'' کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

جلد: ۵
شعبان تا شوال ۱۴۳۵ھ
بمطابق
جولائی تا ستمبر 2014
شمارہ: ۳

سہ ماہی
علمی و تحقیقی
نور معرفت

Declaration No: 7334
ISSN 2221-1659

مدیر اعلی
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

- ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
- ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
- ڈاکٹر سید راشد عباس
- ڈاکٹر کرم حسین ودھو
- ڈاکٹر علی رضا طاہر
- ڈاکٹر سید ناصر زیدی
- سید ثمر علی نقوی
- سید علی مرتضی زیدی

کمپوزنگ رڈیزائننگ: بابر عباس
پرنٹرز: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ 130 روپے
زرسالانہ 500 روپے
زرسالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرسالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

"نمت" (نور الہدیٰ مرکز تحقیقات)
نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ) سادات کالونی بارہ کہو، اسلام آباد
051-2231937 www.nmt.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

نوٹ: ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	گفتنی ہا	مدیر	۹
۳	مسلمانوں کے درمیان قرآن کی تنہائی	سید رمیز الحسن موسوی	۱۹
۴	حروف مقطعات (۱) مختلف آراء تجزیاتی مطالعہ	ثاقب اکبر	۳۷
۵	عقیدہ رجعت قرآن وحدیث کی روشنی میں	سید عقیل حیدر زیدی	۵۳
۶	حضرت محمد ﷺ : امن وآشتی کے پیکر	ڈاکٹر عباس حیدر زیدی	۹۱
۷	رضاعتِ پیغمبر ﷺ کی روایتوں کا تحقیقی جائزہ	ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی	۹۹
۸	الٰہی اقتصادیات کے بنیادی اصول (۲)	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۱۳۳
۹	حکومت کی ضرورت واہمیت (نہج البلاغہ کی روشنی میں)	روشن علی	۱۴۹
۱۰	فہم القرآن کی مشکلات اور خطرات	علی محمد قاسمی	۱۶۹

کچھ "نَمُت" کے بارے میں

" نَمت " (NMT) "نور الہدیٰ مرکز تحقیقات "کا مخفّف اور "نور الہدیٰ ٹرسٹ "کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا نصب العین، اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم اور بالخصوص ملت تشیّع کو فکری پسماندگی سے نجات دلا کر اسلامی تہذیب کی تشکیلِ نو کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ نور الہدیٰ ٹرسٹ کی نظر میں اسلامی تہذیب کی حیاتِ نو واحد راستہ، اسلام کی حقیقی تعلیمات کو ضروری تحقیق اور جانچ پڑتال کے بعد افراد ملت کے سامنے رکھنا ہے۔ ٹرسٹ ہٰذا نے اپنی استطاعت کے مطابق پاکستان کی مخلص مسلمان امت کی اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش میں تحقیقات کی بنجر سرزمین پر "نَمت" کا پوداِاس یقین کے ساتھ کاشت کیا ہے کہ :

"ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی ذرخیز ہے ساقی ! "

اگرچہ " نَمت "(NMT) "نور الہدیٰ مرکزِ تحقیقات" کا مخفّف ہے؛ لیکن یہ حسُنِ اتفاق ہے کہ عربی لغت میں "نَمُت" ایک ایسی جڑی بوٹی کا نام بھی ہے جس کا پھل کھایا جاتا ہے۔(1) یقیناً "نَمت" وہی "نَمُت" ہے جسے نور الہدیٰ ٹرسٹ نے دیارِ علم و تحقیق کی بنجر سرزمین پر کاشت کیا ہے۔ لیکن اس امید پر کہ یہ سرزمین ایک دن ضرور آباد ہو گی اور یہاں کئی نہال کاشت کیے جائیں گے جن کے پروان چڑھنے سے اِس دھرتی پر تحقیقات کا چمن آباد ہو گا (ان شاء اللہ)۔

بہر صورت، دینی بصیرت وآگہی کو فروغ دینے والی کتب کی تالیف، ترجمہ اور اشاعت "نَمت" کا مشن ہے۔ یہاں اِس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ جہاں تحقیق پر ہمارا اصرار ہے، وہاں ہماری فکری نہج

1۔ الزبیدی، تاج العروس۔

(راستہ) بھی بڑی واضح ہے۔ ہمارے منابع میں قرآن کریم سرفہرست ہے۔ اس کے بعد ہم سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتے ہیں جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے بعد ہمارے اساسی منابع میں اصول کافی، من لا یحضرہ الفقیہ، تہذیب الاحکام، الاستبصار، نہج البلاغہ اور صحیفۂ کاملۂ سجّادیہ شمار ہوتے ہیں۔ اِن منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ واستخراج میں ہماری روش بھی بڑی روشن ہے۔ ہم مکتبِ تشیّع کے اندر اُس فکری روش کے علمبردار ہیں جس کے بہترین نمائندہ حضرت امام خمینیؒ ہیں۔

الحمد للہ! ہمارا ادارہ اپنی فعالیت کے تقریبا چھ سالوں میں حیاتِ فاطمہ (س)، تعلیم الاحکام، امام خمینیؒ کی ایک مغربی دانشور سے ملاقات، حضرت زینب (س)، تاریخ کا ایک ناگزیر کردار، اسلامی پردہ، سول سوسائٹی، امام خمینیؒ کا سیاسی نظریہ، قرآن اور نفسیاتی دباو، معجزہ کیا ہے؛ حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت اور تعلیمات جیسی قابل ذکر مطبوعات، علمی حلقوں کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، "پیام قرآن" جیسی عظیم موضوعی تفسیر کی آخری تین جلدوں کا ترجمہ اور مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" کے ۲۵ شماروں کی مسلسل اشاعت بھی "نَمت" کا ایک عمدہ کارنامہ ہے۔ "نَمت"، قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام، اخلاق و عرفان اور دیگر متنوع موضوعات پر مکتب اہل بیت اطہار علیہم السلام کی تعلیمات کی روشنی میں اردو زبان میں تحقیقی لٹریچر پیش کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اِس امید کے ساتھ کہ پاکستان کی مسلم امّت اور خاص طور پر اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مکتب کے پیروکار، اِس نہالِ تحقیق کی آبیاری میں اپنے حصّے کا چلو بھر پانی ضرور ڈالیں گے۔

ڈائریکٹر "نَمت"

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

اداریہ

نور معرفت کا پچیسواں مسلسل شمارہ تیاری کے مراحل سے گزر رہا تھا کہ ملک میں سیاسی بحران شروع ہو گیا۔ ۱۴/اگست ۲۰۱۴ء سے انقلاب مارچ اور آزادی مارچ اپنے پورے جوش وخروش کے ساتھ لاہور سے اسلام آباد کی طرف گامزن ہونے کے بعد اسلام آباد میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے براجمان ہیں۔ یہ دھرنے کبھی پُر امن ہوتے ہیں تو کبھی تشدّد کا عنصر بھی اِن کے شاملِ حال ہو جاتا ہے۔ ملک میں بے یقینی کی کیفیت طاری ہے۔ معلوم نہیں سیاسی بحران کا یہ اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

ہاں! ایک بات طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ پاکستانی جوان نسل اس ملک کے موجودہ سیاسی نظام سے اُکتا چکی ہے اور اِس میں بنیادی تبدیلیوں کی خواہاں ہے۔ لہٰذا ہمیں ان حالات سے عبرت لینا ہے اور اِس سیاسی ہلچل کے تمام زاویوں کو پوری توجہ سے مطالعہ کرنا ہے۔ ہمیں یہاں کسی جزئی مسئلے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ گویا یہ حالات ہمارے دانشور طبقے اور سیاسی شعور کے حامل سنجیدہ لوگوں کی بالغ نظری کا امتحان ہیں کہ وہ عالمی تناظر میں اپنے ملک کے ان حالات کا کس طرح تحلیل و تجزیہ کرتے ہیں۔

جہاں تک نور معرفت کے موجودہ شمارے کا تعلق ہے تو یہ شمارہ بھی چند جدید علمی جواہر پاروں کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہ علمی جواہر پارے ہمارے فاضل لکھاریوں کی ذہنی اور فکری عرق ریزی کا نتیجہ ہیں۔ حسبِ معمول گفتنی ہا کے عنوان سے اپنے معاشرے کے دو سلگتے مسئلوں کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ یہ عنوان اپنی تنقیدی تلخی کے باوجود سوچ کے نئے زاویے سامنے لاتے ہیں۔ قرآنیات کے موضوع پر حضرت امام خمینیؒ کی افکار کی روشنی میں " مسلمانوں کے درمیان قرآن کی تنہائی " کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر " حروف مقطعات (۱)، مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ " کے عنوان سے ایک عالمانہ تحریر پیشِ خدمت ہے۔

اس کے بعد امامیہ عقاید کے ایک معرکۃ الآرا کلامی موضوع (رجعت) پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک تحقیقی مقالہ شامل کیا گیا ہے۔ سیرت النبیؐ کے باب میں " حضرت محمد ﷺ: امن وآشتی کے پیکر " اور " رضاعتِ پیغمبر ﷺ کی روایتوں کا تحقیقی جائزہ " کے عنوان سے دو مقالے پیش کیے گئے ہیں۔ "الٰہی

اقتصادیات کے بنیادی اصول "کا دوسرا حصہ بھی پیش کیا جارہا ہے جس سے رزق و روزی کی تلاش میں عمر بھر سرگرم رہنے والے صاحبانِ ایمان کے لیے ہدایت کا کافی سامان میسر ہے۔

اسی طرح نہج البلاغہ کے موضوعاتی مطالعے کے سلسلے میں "حکومت کی ضرورت و اہمیت (نہج البلاغہ کی روشنی میں) "کے نام سے بھی ایک مقالہ شامل کیا گیا ہے جو نہج البلاغہ کے شائقین کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ترجمہ کے باب میں " فہمُ القرآن کی مشکلات اور خطرات "کے عنوان سے ایک فارسی مقالے کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔اس شمارے میں بھی تمام مقالات کے خلاصہ جات کا انگلش ترجمہ فاضل برادر جناب میثم علی نے کیا ہے۔ میں مدیرِ مجلّہ کی حیثیت سے نورِ معرفت کے تمام مقالہ نگاروں، مترجمین اور اپنی ٹیم کا شکر گزار ہوں اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اِن تمام احباب کی یہ خدمت اپنی بارگاہ میں مقبول فرمائے۔(آمین!)

گفتنی ها

ہمارا مروّجہ اندازِ خطابت اور زوالِ ملت

سید رمیز الحسن موسوی*

جب کسی مملکت اور معاشرے میں جاگیر دارانہ اور استبدادی نظام رائج ہو جائے تو اس معاشرے میں قدر و منزلت کے ایسے معیارات پروان چڑھنے لگتے ہیں کہ جو جاگیر داروں اور آمروں کے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں، ایسے معاشرے میں اُن لوگوں کی قدر دانی ہوتی ہے جو امیروں اور جاگیر داروں کو خوش رکھ سکیں، اس کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن میں سے ایک ترکیب، گفتگو کو دل آویز اور تقریر کو موثر بنانا ہے؛ لیکن چونکہ علمی معارف اور مباحث سے اُمراء اور آمر خوش نہیں ہوتے؛ اس لئے جاگیر داری نظام میں جکڑے ہوئے معاشروں میں علمی گفتگو اور بحث مباحثہ کوئی اچھا مشغلہ نہیں بن سکتا ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ کہ خوبصورت الفاظ خود سحر اور جادو کا سا اثر رکھتے ہیں، وہ نہ صرف سننے والے کو بلکہ بولنے والے کو بھی لطف اندوز کرتے ہیں۔ مقفّیٰ نثر، مترنّم اشعار، فقرے بازی، نکتہ سنجی، چٹکلے اور طرح طرح کی عبارت آرائی، ایک ایسا نشہ ہے جس کی عادت پڑ جائے تو مشکل سے جان چھوٹتی ہے، ایسے میں ہر خطیب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خوبصورت الفاظ تلاش کیے جائیں، خواہ معانی جیسے بھی ہوں۔ لہٰذا معنیٰ اور موضوع کی صحت اور اہمیت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

---

* ۔ مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نورالہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الفاظ کا حُسن اور خطابت کا زور، علم و معرفت کے بیان پر غالب آ جاتا ہے اور قوم پر ایک طویل سرور اور نشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں خطابت افیون بن جاتی ہے اور اِس افیون کا نشہ بعض اوقات صدیوں تک باقی رہتا ہے۔

بد قسمتی سے اِس وقت ہماری قوم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہے۔ یہ قوم الفاظ کے حسن، لفاظی کے نشے اور خطابت کے جادو سے کچھ ایسی سحر زدہ ہے کہ اب علمی گفتگو اور معرفت افزا موضوعات پر تقریر اِس قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو بُری لگتی ہے۔ ہماری قوم الفاظ کے حسن، لفاظی کے نشے اور خطابت کے جادو سے کچھ ایسی سحر زدہ اور نشے میں مست ہے کہ اب علمی باتیں اور دینی معارف پر مبنی گفتگو قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو بُری لگتی ہے۔ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی جانب سے غم حسینؑ اور ذکر اہل بیتؑ کی جو تاکید کی گئی ہے وہ دلوں کو زندہ کرنے اور قلوب کو معنویت عطا کرنے کے لئے تھی۔

در حقیقت ذکر حسینؑ انسانوں کو متحرک کرتا ہے اور وہ اُسوۂ حسینی اپنا کر ظلم و ستم کے مقابلے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں؛ لیکن خطابت اور لفاظی کے سحر نے اسے نشہ بنا دیا ہے اور کچھ تقاریر، قوم کے لئے افیون کا کام کرنے لگی ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نجات کا سفینہ ہیں اور آپؑ کا ذکر انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہے۔ لیکن جب اسے لفاظی، مقفّٰی عبارتوں، دھواں دھار تقریروں، چٹکلوں اور فقرے بازیوں کی نذر کر دیا جائے تو یہ بھی سُننے والوں کو غفلت کی نیند سُلا دیتا ہے۔

ایک ممتاز محقق لکھتے ہیں:

> "مغربی مؤرخین گبن سے لے کر مائیکل گرانٹ اور جونز تک متفق ہیں کہ مملکت روم کے زوال میں نظام تعلیم، علوم سے بے اعتنائی اور شوقِ خطابت کا بہت بڑا کردار ہے، خالص ادبی تربیت اور شوق خطابت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل روم عقلی علوم کی طرف توجہ نہ دے سکے اور کوئی بڑا فلسفی، سیاستدان، ماہر اقتصادیات یا سائنسدان پیدا نہ ہو سکا"۔

بر صغیر پاک و ہند میں بھی انگریز استبداد نے آمریت، جاگیرداری اور سرمایہ داری کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں قوم کے مزاج میں تملق گوئی اور خوشامد پسندی پروان چڑھی۔ جس کے اثرات ہمارے مذہبی مراسم اور عبادات پر بھی اثرانداز ہوئے اور ہم دین و مذہب میں بھی عقلانیت کی بجائے جذباتی پن اور

رومانیت کی طرف مائل ہو گئے، حتیٰ عزاداری امام حسین علیہ السلام کہ جو ہمارے نزدیک ایک تحرک آفرین سیاسی اور عبادی عمل ہے، بھی اسی جذباتیت اور رومانیت کی نذر ہو کر رہ گیا۔

بر صغیر میں شروع ہی سے عزاداری کو راجوں، نوابوں اور اعلیٰ حکام کی سرپرستی حاصل تھی اور علمائے دین کو ہمیشہ اس سے دور رکھا گیا جس کی وجہ سے ذکر حسینؑ کا علمی اور عقلی پہلو جذبات واحساسات میں گم ہو کر رہ گیا، یہاں پیشہ ور مقررین، خطباء، ذاکرین اور نوحہ خوانوں کی لفاظی، مقفّٰی عبارتوں اور غنا آلود مرثیوں نے کربلا کے ذکر سے کردار کی تعمیر کی بجائے اُن کی تفنّن طبع کا سامان مہیا کیا ہے۔

بر صغیر کے علاوہ دیگر ممالک کے لوگوں اور دوسری اقوام وملل نے بھی ذکر حسینؑ اور عزاداری امام مظلومؑ بر پا کی ہے؛ لیکن وہاں امراء اور سرمایہ داروں کی بجائے علمائے دین نے اس کی سرپرستی کی ہے، جس کی وجہ سے اس کا عقلی اور دینی پہلو، اس کے جذباتی اور عاطفی پہلو پر غالب رہا ہے، وہاں ذکر حسینؑ، ظلم وستم کے خلاف ایک آواز میں تبدیل ہو گیا ہے اور ظالم وستم گر شہنشاہوں کے ایوان عزاداروں کی فریادوں اور حسینیت کا پرچار کرنے والے خطیبوں کی آوازوں سے لرزنے لگے اسی ذکر حسینؑ نے ایرانی قوم کو ڈھائی ہزار سالہ ستم شاہی نظام سے نجات دلادی اور یہی ذکر حسینؑ حزب اللہ (لبنان) کے مجاہدین کو صیہونی ظالموں کے مقابلے میں سیسہ پلائی دیوار بنا چکا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں یہی ذکر حسینؑ ہماری جذباتی خطابت، لفاظی اور نکتہ بازیوں کی وجہ سے بیدای ملت کی بجائے اُسے خواب غفلت میں لے جانے کا سبب بن گیا ہے۔ محرم الحرام جیسا حماسہ آفرین مہینہ ہر سال آتا ہے؛ لیکن اس میں امام حسین علیہ السلام کے ظلم ستیز آفاقی اور الٰہی کردار کے مطالعے کی بجائے ہم لوگ فقرہ بازی پر مبنی خطابت نیز موسیقی اور غنا بھری آوازوں میں قصیدے، نوحے اور مرثیے سننے کے منتظر ہوتے ہیں۔

کیونکہ کوئی عالم دین، دینی معارف اور قرآن اور اہل بیتؑ کے علوم کا پرچار کرنے کی سعی کرتا بھی ہے تو اُسے سننے والے بہت کم ملتے ہیں؛ مگر جہاں لفاظی اور عبارت آرائی کا مظاہرہ کرنے والا مقرر اپنی خطابت کا جادو جگا رہا ہوتا ہے وہاں عوام کا رش لگا ہوتا ہے اور یہی مجلس، مقبول مجلس سمجھی جاتی ہے۔ زوال ملت کے اسباب کا مطالعہ کرنے والوں کو قوم کے زوال کے اس پہلو پر ضرور توجہ دینی چاہیے کیونکہ جب تک

محبانِ حسینؑ کے جذبات سے کھیلنے والے مقررین موجود ہیں، اس قوم میں حسینی روح پھونکنا ناممکن ہے اور عزاداری امام مظلوم کے ذریعے ظلم وستم کے ایوان گرانے محال ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے اہم کردار بانیان مجالس کا ہے کہ وہ ان مجالس عزا کو کس نیت سے برپا کرتے ہیں، کیا وہ محض ایک رسم کے طور پر عزاداری منانا چاہتے ہیں اور ایک عادت پوری کرنا چاہتے ہیں؟ یا عزاداری مظلوم کربلا کے ذریعے کربلا کے مظلوموں کا پیغام زندہ کرنا چاہتے ہیں اور اہل بیت اطہارؑ کے فرمان کے مطابق "امر دین کا احیاء" کرنا چاہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور قربانی دین خدا کے احیاء کے لئے تھی، اگر ہم بھی عزاداری امام مظلومؑ کے ذریعے اسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں معارف کربلا کو زندہ کرنا ہوگا اور ایسے خطباء اور ذاکرین کی خدمات حاصل کرنا ہوں گی جو اسی نیت اور مقصد کی خاطر منبر حسینیؑ پر آتے ہیں اور اسے ایک الٰہی فریضہ سمجھتے ہیں۔

دین خدا آج بھی مظلوم ہے، اسلام آج بھی تنہا ہے، قرآن آج بھی مہجور ہے، اسے اگر زندہ کیا جاسکتا ہے اور تنہائی سے نکالا جاسکتا ہے تو فقط کربلا اور عاشورا کے ہی ذریعے سے زندہ کیا جاسکتا ہے، مگر وہ کربلا اور عاشورا جو ۶۱ ہجری میں سرزمین نینوا پر رونما ہوا تھا نہ وہ کربلا وعاشورا کہ جو ہم علاقائی رسم ورواج اور ثقافتوں کے ذریعے وجود میں لائے ہیں۔ وہ حقیقی کربلا ہے کہ جس میں اسلام زندہ ہوتا ہے، اصول دین اور فروعات دین کی آبیاری ہوتی ہے، ظلم وستم کی حوصلہ شکنی اور مظلوموں کی اشک شوئی ہوتی ہے اور جس میں خطباء، خطبات حسینیؑ کا پرچار کرتے ہیں نہ مظلومیت حسینؑ کے ذریعے ہیں۔ بقول شاعر انقلاب جوش ملیح آبادیؒ نے

سوچ تو اے ذاکرِ افسردہ طبع نرم خو — آہ تو نیلام کرتا ہے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤہو — فیس کا دریوزہ ہے منبر پر تیری گفتگو

بہرحال یہ بانیان مجالس ہیں کہ وہ کس قسم کے خطباء کو دعوت سخن دیتے ہیں اور کس طرح کی عزاداری برپا کرنا چاہتے ہیں؛ اگر اُن کی برپا کردہ مجالس عزا سے دین خدا زندہ ہوتا ہے اور پیغام کربلا کو فروغ ملتا ہے تو وہ ائمہ طاہرینؑ کے فرامین کے مطابق عظیم اجر وثواب کے مستحق ہیں اور یقیناً آخرت میں شفاعت

حسینؑ سے بہرہ مند ہوں گے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ حسین ابن علیؑ "سفینۃ النجات" ہیں اور آپؑ کا ذکر بھی مظلوم اقوام کے لئے سفینۂ نجات ہے۔

الحمد للہ ! آج بہت سی مجالس عزا سفینۂ نجات بن رہی ہیں اور لوگوں میں دینی شعور پیدا ہونے کی وجہ سے علمائے دین اور تفقہ فی الدین رکھنے والے خطباء کے ذریعے یہی مجالس پیغام کربلا کے فروغ کا باعث بن رہی ہیں اور ہم غفلت زدہ خطابت سے تحرک اور شعور پیدا کرنے والی خطابت کی طرف سفر شروع کر چکے ہیں۔

اُمورِ مملکت کی اصلاح کے اہتمام کی ضرورت

اسلامی معاشرے کے حوالے سے علمائے اسلام اور اُن کے زیر اہتمام چلنے والے اداروں کی ذمہ داریاں بہت سنگین ہیں۔ دینی مدارس ہوں یا دوسرے تعلیمی، تحقیقی اور رفاحی ادارے ،قرآن و سنت کے مطابق اُن کی سب سے بڑی ذمہ داری مسلمانوں کے اُمور، مسائل اور مشکلات کی طرف توجہ دینا ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی ،اس کی تمام مشکلات ،مسائل اور خامیوں کی اصلاح کا فریضہ اور ان کا راہ حل علمائے اسلام کے ذمہ ہے ؛اس لیے کہ دین اسلام ایک اجتماعی دین ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ دین اور اس کی الہامی کتاب قرآن مجید میں انسانوں کے فردی واجتماعی مسائل کے لئے ہدایت اور رہنمائی موجود ہے اور ہمارا دین ہر شعبۂ زندگی میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔

اس وقت پورے عالم اسلام سے صرف نظر کرتے ہوئے فقط پاکستانی معاشرے ہی کو دیکھیں تو یہاں کے مسلمان بے شمار مسائل ومشکلات کا شکار ہیں ،نہ فقط تعلیم کے میدان میں؛ بلکہ قوم کی اجتماعی،اخلاقی ، سیاسی اور دینی تربیت کے میدان میں بھی ہماری مشکلات سنگین سے سنگین تر ہوتی جارہی ہیں ،یہ مسائل دن بدن بڑھتے جارہے ہیں اور معاشرے پر علمائے دین کی حقیقی توجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم ایسی بے دینی کی دلدل میں دھنس رہے ہیں کہ جس سے نکلنے کے لئے اگر ملک کے تمام دینی ادارے پورے اخلاص کے ساتھ دن رات بھی کام کریں تو کم ہے۔

ہمارا ایک بنیادی مسئلہ تعلیم ہے ، فقط دنیوی تعلیم کے میدان کو ہی دیکھیں تو نونہالان ملت کس قدر مصائب کا شکار ہیں ،ہمارے بچوں کو بنیادی تعلیم بھی اپنی مادری زبان میں پڑھنے کا حق حاصل نہیں ہے،

ہمارا مظلوم بچہ معاشرتی علوم جیسا مضمون اور اس کی ابتدائی چیزوں کو جاننے کے لئے انگریزی زبان میں کہ جس کی ابھی وہ الف ب سے بھی آگاہ نہیں ہوتا، رٹا لگا کر یاد کرنے پر مجبور ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ شاید تھوڑی بہت انگریزی تو جان لیتا ہے مگر جن علوم وفنون سے اُسے آگاہ ہونا چاہیے اُس کی ابتدائی ترین معلومات سے بھی محروم رہ جاتا ہے، کیا ہم نے کبھی امتحانات کے دنوں میں اپنے بچوں کی اس مشکل کی طرف توجہ کی ہے؟ کیا ہم نے کبھی سوچا ہے کہ ہمارا معیار تعلیم دن بہ دن کیوں گر رہا ہے؟ دینی مدارس میں آنے والے بچے میٹرک کی سند رکھنے کے باوجود اُردو زبان کے چند جملے بھی درست انداز میں نہیں بول سکتے، یہ تو تعلیمی مشکلات کی ایک جھلک تھی اس کی تفصیل تو ماہرین ہی بتا سکتے ہیں۔

اخلاقی واجتماعی تربیت کے میدان میں قوم کے بچوں سے لے کر ادھیڑ عمر کے مرد وخواتین تک جس پستی اور انحطاط کا شکار نظر آتے ہیں، اُس سے واضح ہوتا ہے کہ قوم کی تربیت کرنے والے برسوں سے خواب غفلت میں ہیں، اس حوالے سے اگر اسلام آباد میں ہونے والے حالیہ سیاسی دھرنوں اور طریقۂ احتجاج ہی کو دیکھ لیں جو تا دمِ تحریر جاری ہیں تو اس سے پوری قوم کے اخلاق و کردار کی جھلک سامنے آ جاتی ہے۔

انقلاب مارچ میں پھر بھی تربیت وتہذیب کے آثار نظر آتے ہیں؛ لیکن آزادی مارچ کا دھرنا جو کہ ایک انتہائی سنجیدہ ہدف کے لئے دیا جا رہا ہے، یعنی ملک کے فرسودہ سیاسی نظام کو سنجیدہ اور کارآمد نظام میں تبدیل کرنا، اِس دھرنے میں سیاسی رہنما اور اُن کے ہمنوا جس انداز کا احتجاج کر رہے ہیں، اُس سے پورے معاشرے کو فقط یہی پیغام مل رہا ہے کہ نئے پاکستان میں پوری قوم (جوان بچیوں سے لے کر ادھیڑ عمر خواتین اور مردوں تک) کو ناچ گانے میں مصروف کر دیا جائے گا۔

پوری دنیا میں سیاسی احتجاج ہوتے ہیں لیکن کہیں نہیں دیکھا گیا کہ قوم کے رہنما، قوم کی بچیوں کو اس طرح ناچ گانے اور لہو ولعب کی طرف لے جا رہے ہوں، یہ تو اخلاقی حوالے سے قومی پستی وانحطاط کی ایک مثال تھی جو ہمارے معاشرے میں موجود دینی اداروں اور علماء کے لئے لمحۂ فکریہ ہے؛ اگر علمائے دین اس قوم کے لئے کوئی اخلاقی نظام بناتے اور قوم کو قرآن وسنت کی اخلاقیات سے آگاہ کرتے تو آج ہمارے نوجوان تو کیا سیاسی رہنما بھی سرے عام ایسی پست اور خلاف مروّت حرکتیں کرنے کی جرأت نہ کرتے۔

جس دن ملک میں کیبل اور جدید میڈیا کے ذرائع سے غیر دینی ثقافت کی ترویج کا کام شروع ہوا تھا اگر اُسی دن علماء اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیئے کہ جو تمام مسلمانوں بالخصوص علمائے دین پر فرض ہے ،تو آج ہمارا معاشرہ اس حالت کو نہ پہنچتا کہ جہاں گناہ ،گناہ نہیں سمجھا جارہا۔ یہ تو اخلاقی میدان تھا، لیکن جہاں تک ہمارے سیاسی نظام کی فرسودگی کا تعلق ہے تو اُس پر جس قدر گریہ اور نالہ و ماتم کیا جائے، کم ہے۔اِس سے قطعِ نظر کہ اسلام آباد میں حالیہ دھرنوں کے قائدین اور اُن کے حامیوں کا رویّہ درست ہے یا نادرست اور ان کے مقاصد اور اہداف ملک و قوم کی بہتری ہے یا اپنے ذاتی منافع ؟ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں عدل و انصاف اور ملک و ملت کے لیے مفید سیاسی نظام کہیں نظر نہیں آتا ہے۔

جمہوریت کے دفاع کے نام پر اکٹھی ہونے والی تمام سیاسی جماعتوں کی کارگردگی بھی قابل مذمت ہے، جمہوریت کو بُت بنانے والے یہ بھول گئے کہ جمہوریت دراصل کس درد کی دوا ہے، جس جمہوری نظام میں عوام کو انصاف نہ ملتا ہو، امیر، امیر سے امیر تر اور غریب، غریب سے غریب تر ہوتا چلا جائے، سیاست وراثت میں تقسیم ہونے لگے اور چند خاندان ملک و ملت کی تقدیر کے بے تاج بادشاہ بن جائیں؟ایسا جمہوری نظام کیونکر احترام اور تقدس کا مستحق ہے؟ وہ جمہوریت جس میں ایک بات محض اس لیے قانون بن جائے کہ جمہور کی رائے ہے، خواہ وہ بات ہر اخلاقی اور عقلی ضابطے کے خلاف ہو، کیوں مقدس گائے بن جائے ؟!

ہم اس ملک میں ہر کسی کی ڈکٹیٹر شپ کی مذمت کرتے ہیں اور اگر یہ آمریت، جمہوریت کا لبادہ اُوڑھ لے تب بھی قابل مذمت ہے، جس جمہوری نظام میں غریب و نادار پر تو ناجائز کیس بھی آسانی سے بن جائے لیکن طاقتور ،لوگوں کی عزت و ناموس پر ڈاکہ ڈالیں، قتل و غارت کا بازار گرم کر دیں اور اُن پر ایف۔آئی۔آر بھی نہ کٹ سکے، یہ کیسا جمہوری نظام ہے اور یہ کیونکر قابل احترام ہو سکتا ہے؟حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کے نام پر سیاسی ثروت کی بندر بانٹ ہو رہی ہے؛اگر یہ حالت بدلنے کا اہتمام نہ کیا گیا تو ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں۔

جہاں تک ہمارے ملک کے معاشی حالات کا تعلق ہے تو بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں دینی معاشی نظام پنپ ہی نہیں پایا ہے، سودی نظام تو ایک طرف، عام بازاروں میں وہ سب کچھ ہو رہا ہے جس کا قرآن

وسنت رسولؐ پر ایمان رکھنے والے معاشرے میں تصور تک نہیں کیا جاسکتا، کیا ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، سود خوری، (نچلی سطح سے اعلیٰ سطح تک) چور بازاری، اقتصادی اور معاشی فساد جس میں حکمرانوں سے لے کر معاشرے کا عام طبقہ تک مبتلا ہو چکا ہے، رشوت اور معاشی اقربا پروری کے بارے میں کوئی دینی وقرآنی احکام موجود نہیں ہیں کہ جس کی وجہ سے دینی ادارے اور علمائے دین خاموش بیٹھے ہیں؟!

کیا مسلمانوں کی عزت نفس، خود اعتمادی، کفار کے سیاسی تسلط سے پرہیز، طاغوت پرستی، کفار سے دوستی اور اُن کے قوانین کی پیروی کے بارے میں کوئی قرآنی آیت موجود نہیں ہے کہ جس پر علمائے دین نے چپ سادھ کر رکھی ہے؟ کیا جمعہ کا دن ہمارے دین میں مقدس نہیں اور ہماری ثقافت کی علامت نہیں ہے؟ کیا جمعہ کی نماز ہمارا ایک سیاسی وعبادی عمل نہیں کہ جو مسلم معاشرے کو یکجہتی کی لڑی میں پرونے کا اہم ذریعہ ہے اور اسلامی سیاست کی بنیاد ہے؟ لیکن نام نہاد مسلمان اور سیکولر حکمرانوں کی طرف سے عرصہ دراز سے جمعہ کی چھٹی کے بجائے کفار کے مقدس دن اتوار کی تعطیل پاکستانی علمائے دین کے لئے لمحہ فکریہ نہیں کہ اس دن کوئی دیندار مسلمان نماز جمعہ میں یکسوئی کے ساتھ شرکت نہیں کرسکتا اور نہ ہماری نوجوان نسل جمعہ کی برکات سے بہرہ مند ہوسکتی ہیں۔ جمعہ کے باب میں ہمارا مرثیہ بہت طولانی ہے جسے ہم کسی اور فرصت کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔

کیا مسلمانوں کی وحدت ویکجہتی کے بارے میں قرآن مجید کی واضح تعلیمات اور ہوشیار باش پر مبنی آیات موجود نہیں ہیں کہ جن میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تفرقے میں پڑوگے تو تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، کیا اس واضح قرآنی تنبیہ کے باوجود ہمارے دینی ادارے اور شخصیات ہی اس قرآنی حکم کی مخالفت کرتی ہوئی نظر نہیں آتیں؟ کیا پاکستان کے معاشرے میں مسلمان فرقہ در فرقہ تقسیم نہیں ہو چکے؟ کیا اس پر کسی جید عالم دین اور مستند دینی ادارے نے کوئی قدم اُٹھایا ہے یا کم از کم سوچا تک ہے؟

کیا دین اسلام میں بچوں کے حقوق نہیں ہیں اور والدین کی سرپرستی سے محروم یتیم ونادار بچوں کے بارے میں قرآن وشریعت میں کوئی قانون اور احکام موجود نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو ہمارے معاشرے میں کیوں ہزاروں بچے اجتماعی بے حسی کا شکار بنے ہوئے ہیں؟ اس وقت بچوں کے استحصال اور دیگر حوالوں سے ظلم وستم کا نشانہ بننے کے حوالے سے بعض اخباری رپوٹوں میں جو کچھ آرہا ہے وہ ہمارے دینی نظام کے لئے ایک سوالیہ نشانہ ہے، کیا خواتین کے بارے میں قرآن اور معلم قرآن ﷺ نے کوئی تعلیمات نہیں دیں

کہ آج مسلمان خاتون سیاسی بازیگروں سے لے کر معاشی اور جنسی ہوس پرستوں کی ہوس پرستی کا نشانہ بنی ہوئی ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر اس وقت ملک میں خود علمائے دین کی آبرو وحیثیت داؤپر لگی ہے، ملک میں دینی مرکزیت اور مرجعیت کا کوئی واضح معیار نہ ہونے کی وجہ سے سطحی دینی تعلیم کے ساتھ ہر لفنگا، ڈنڈے باز، مادی، سیاسی طاقت اور مکارانہ چالاکی کے بل بوتے پر ملک کا مفتی اعظم، دین کا سب سے بڑا علمبردار، مختلف نوظہور فرقوں کا سرپرست اعلیٰ اور مرشد کامل بنا ہوا ہے اور جید و باتقویٰ علمائے دین گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں تمام مستند اسلامی فرقوں کے جید اور باتقویٰ علمائے دین موجود ہیں جو دین کا درد بھی رکھتے ہیں اور معاشرے کے دین مخالف رویوں پر خون کے آنسو بھی بہا رہے ہیں؛ لیکن اُن کی خاموشی اور ذمہ داریوں سے پہلو تہی نے چند عیار اور دنیوی معاملات کے ماہر، مکار اور نام نہاد علما کو معاشرے میں اپنی دکانیں چمکانے کا موقع فراہم کیا ہوا ہے، یہی وہ علمائے سُوٗ ہیں جن کے بارے میں قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کی واضح تعلیمات موجود ہیں مگر ہم ان سے غافل ہیں، معاشرہ اُسی وقت دین دار بن سکتا ہے جب دیندار لوگوں کی سرپرستی میں ہو، بے دین علما اور بے دین، دینی ادارے کس طرح معاشرے کو دین دار بنا سکتے ہیں۔

پاکستان کے مسلمان بے شمار سماجی مسائل کی وجہ سے نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو چکے ہیں مگر جن کی درست روحانی اور دینی رہنمائی کا خاطر خواہ اہتمام نہ ہونے کی وجہ سے جھوٹے، دغا باز اور بے دین پیروں، فقیروں اور جادوٹونے کے ماہر عاملوں کی دکانداری کا بازار گرم ہے اور ہزاروں مظلوم عورتیں اور ان پڑھ اور کمزور ایمان مسلمان ان کے جال میں پھنس رہے ہیں اور اپنے مال ودولت کے علاوہ اپنی عزت وناموس بھی گنوا رہے ہیں، کیا جادوگروں اور عاملوں کے بارے میں علمائے اسلام کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

اہل قبلہ کو اپنا ہم فکر نہ ہونے کی وجہ سے کفر کے فتوؤں سے تو نوازا جاتا ہے اور اُن کے قتل کے اسباب فراہم کئے جاتے ہیں؛ لیکن آج تک کسی دار الافتاء کی جانب سے ان جادوگروں اور اللہ کے عذاب سے بے خبر عاملوں کے بارے میں کسی مفتی نے کوئی فتویٰ نہیں دیا اور نہ جنت کے مشتاق کسی خود کش نے

ان کو قتل کرکے شہادت کا درجہ پایا ہے، ان جنت کے مشتاق خودکشوں نے کبھی بھی کسی عامل وجادوگر کی دکان تباہ نہیں کی؛ البتہ ہزاروں نمازی ضروری قتل کیے ہیں۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں چند مثالوں سے پاکستانی مسلمان معاشرے کی مصائب بیان کرنے کو شش کی ہے، جن سے پاکستانی معاشرے کے بے شمار مسائل اور مشکلات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، حالیہ سیاسی ہلچل اور قومی اخلاقی حالت کی عکاسی کرنے والے نظارے ہمارے دین دار علمائے دین اور درد آشنا اداروں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہونے چاہئیں۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا کہ موجودہ حکومت اور سیاسی جماعتوں نے ان سیاسی ہنگاموں کو کس نظر سے دیکھا ہے یقیناً اُنہوں نے اپنے سیاسی مفادات ہی کے تناظر میں ان کا حل نکالنا ہے، ہمارے لیے یہ اہم ہے کہ عالم دین اور میراث انبیاء کے وراث ہونے کی حیثیت سے معاشرے کے ان مسائل کو ہم کس نظر سے دیکھ رہے ہیں؟ کیا چند روزہ دنیوی مفاد اور چند روزہ مادی زندگی کے بدلے ہم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے سامنے مسلمان معاشرے کی ان مشکلات کے سلسلے میں جوابدہ ہونے کی ہمت رکھتے ہیں؟ کیا ان دردناک مشکلات کا شکار ہونے والے مسلمان مستضعف بچے، نوجوان، عورتیں اور مرد ہماری رہنمائی کے محتاج نہیں ہیں اور ہم اُن کی اس احتیاج کو پورا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں؟ ایک حقیقی عالم دین کو بیدار کرنے کے لئے تو پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ فرمان ہی کافی ہے کہ جس میں آپؐ نے فرمایا:

"من اصبح لایهتم بامور المسلمین فلیس بمسلم ومن سمع رجلا ینادی یا للمسلمین فلایجبه فلیس بمسلم"

یعنی "جو اس حال میں صبح کرے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل اور اُمور کی طرف متوجہ نہ ہوا اور اس نے ان کا اہتمام نہ کیا ہو تو وہ مسلمان نہیں اور جو کسی مظلوم کی فریاد سنے اور اس کا جواب نہ دے وہ بھی مسلمان نہیں ہے۔"

(افکار امام خمینیؒ)

مسلمانوں کے درمیان قرآن کی تنہائی

سید رمیز الحسن موسوی *

srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: مہجوریت، استبداد، جمال الدین، خمینیؒ، قرآنی اصطلاحات، ثقلین، دین اور سیاست میں جدائی۔

خلاصہ

مفسرین نے "ہجرت" کے لغوی معنیٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے مہجوریّت کا معنیٰ قرآن کو قبول کرنے کے بعد اُسے ترک کرنا لیا ہے۔ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اپنی مہجوریّت (تنہائی) کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ امام علیؑ نے بھی نہج البلاغہ میں قرآن کی تنہائی کا مرثیہ پڑھا ہے۔ گویا آپ آخری زمانے میں قرآن کی مہجوریت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ قرآن کی اِس تنہائی کا تذکرہ ہر دور کے مسلمان مفکرین نے بھی کیا اور اِسے اُمت مسلمہ کا زوال وانحطاط کا سبب قرار دیا ہے۔

تاریخی لحاظ سے سید جمال الدین افغانیؒ نے قرآن کی تنہائی کو بہت نمایاں صورت میں پیش کیا۔ اُن کے بعد چودھویں صدی کے شروع میں امام خمینیؒ نے اپنی انقلابی تحریک کے دوران ہر تحریر و تقریر اور گفتگو میں قرآن کی مہجوریت کا اظہار کیا اور قرآن کریم کو صدیوں پرانی تنہائی سے نکالنے اور قرآن کی طرف بازگشت کے لئے سنجیدہ جدوجہد کی ہے۔ انہوں نے اسلامی انقلاب کی علمی بنیادیں قرآن مجید ہی پر استوار کیں۔ لہٰذا حضرت امام خمینیؒ وہ منفرد شخصیت ہیں جنہوں نے اور آج اُن کی اس جدوجہد کے اثرات علمی و عملی میدان میں نظر آرہے ہیں۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے بہت سی قرآنی اصطلاحات کا احیاء کیا۔ اس مقالے میں امام اُمت کے انہی بیانات اور فرامین کو جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

---

* ۔ مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بھارہ کہو، اسلام آباد۔

مقدمہ

مسلمانوں کے درمیان قرآن کی مہجوریت (تنہائی) کا موضوع صدیوں پرانا ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بھی اس موضوع پر بحث ہوتی رہی ہے جس کی واضح ترین دلیل سورہ ٔفرقان کی آیت نمبر ۳۰ ہے، جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کریں گے کہ میری قوم نے قرآن کو تنہا چھوڑ دیا :

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا۔

یعنی "اور رسولِ (ﷺ) عرض کریں گے : اے ربّ ! بیشک میری قوم نے اس قرآن کو بالکل ہی چھوڑ رکھا تھا۔"

اگرچہ بعض مفسرین نے مہجوریت قرآن سے مراد مشرکین کی طرف سے قرآن کی آیات کو جھوٹ اور ہذیان قرار دینا لیا ہے اور کچھ مفسرین کے مطابق مشرکین کا دعوت پیغمبرؐ کو قبول نہ کرنا قرآن کو مہجور کرنے کے مترادف ہے؛ لیکن بہت سے مفسرین نے ''ہجرت'' کے لغوی معنیٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا معنیٰ قرآن کو قبول کرنے کے بعد اُسے ترک کرنا اور اُس سے دور ہونا لیا ہے اور اس معنیٰ میں ہر زمانے کے مسلمان شامل ہیں۔

حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے بھی اسی معنیٰ کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے بعد اسلامی معاشرے کی افسوسناک صورت حال کا جو نقشہ کھینچا ہے اُس کے مطابق قرآن لوگوں کے درمیان مہجور اور تنہا ہو جائے گا۔اس سلسلے میں امام علیہ السلام ایک خطبے میں فرماتے ہیں :

'' میرے بعد تم پر ایک ایسا دور آنے والا ہے جس میں حق بہت پوشیدہ اور باطل بہت نمایاں ہوگا اور اللہ اور رسولؐ پر افتراٗ پردازی کا زور ہوگا، اس زمانہ والوں کے نزدیک قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہ ہوگی جبکہ اسے اس طرح پیش کیا جائے گا جیسے پیش کرنے کا حق ہے اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں ہوگی۔ اس وقت جبکہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جائے گا اور (ان کے) شہروں میں نیکی سے زیادہ کوئی برائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہیں ہوگی، چنانچہ قرآن کا بار اٹھانے والے اسے پھینک کر الگ کریں گے اور حفظ کرنے والے اس کی (تعلیم) بھلا بیٹھیں گے اور قرآن اور قرآن والے (اہلبیتؑ) بے گھر اور بے در ہوں

گے اور ایک ہی راہ میں ایک دوسرے کے ساتھی ہوں گے انہیں کوئی پناہ دینے والا نہ ہوگا۔ وہ (بظاہر) لوگوں میں ہوں گے؛ مگر ان سے الگ تھلگ، ان کے ساتھ ہوں گے مگر بے تعلق اس لیے کہ گمراہی ہدایت سے سازگار نہیں ہو سکتی۔

اگرچہ وہ یکجا ہوں، لوگوں نے تفرقہ پردازی پر تو اتفاق کر لیا ہے اور جماعت سے کٹ گئے ہیں گویا کہ وہ کتاب کے پیشوا ہیں کتاب ان کی پیشوا نہیں، ان کے پاس تو صرف قرآن کا نام رہ گیا ہے اور صرف اس کے خطوط و نقوش کو پہچان سکتے ہیں۔ اس آنے والے دور سے پہلے وہ نیک بندوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا چکے ہوں گے اور اللہ کے متعلق ان کی سچی باتوں کا نام بھی بہتان رکھ دیا ہوگا اور نیکیوں کے بدلے میں انہیں بری سزائیں دی ہوں گی''۔(1)

امام علیہ السلام کے اس خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا حضرتؑ مسلمانوں کی آخری صدیوں میں حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور قرآن کی مہجوریت اور کسمپرسی کا مشاہدہ کر رہے ہیں، مسلمانوں کی اس حالت کا کم از کم نتیجہ مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کی شکل میں سامنے آتا ہے جس کا تسلسل ابھی تک باقی ہے۔ قرآن سے دوری اور مسلمانوں کے درمیان کتاب الٰہی کی تنہائی و مہجوریت کے بارے میں ہر دور کے مسلمان مفکرین کی فریادیں بلند ہوتی نظر آتی ہیں۔

اگرچہ بعض افراد نے یورپ میں رنسانس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے افکار کی بنا پر ''دین پسندی'' کو مسلمانوں کے زوال کا سبب قرار دیا ہے اور دین سے دوری کو ہی مسلمانوں کی ترقی اور پیش رفت کا حقیقی سبب جانا ہے؛ لیکن اس کے مقابلے میں اُمت مسلمہ کے اکثر دردمند مفکرین اور رہنماؤں نے مسلمانوں کے زوال اور عقب ماندگی کے دو بڑے اسباب یعنی ''داخلی استبداد'' اور ''بیرونی استعمار'' کے ساتھ ساتھ قرآن اور اصیل اسلامی تعلیمات سے دوری کو بھی مسلمانوں کے زوال کی بنیاد قرار دیا ہے؛

لہٰذا مسلمانوں کو اس مشکل سے نکالنے کے لئے تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں مسلمان مصلحین کے درمیان اصیل اسلامی تعلیمات اور قرآن کی طرف بازگشت کا نظریہ اُجاگر ہونے لگا کہ جس کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں قرآن کی طرف رجوع کرنے کی دعوت عام ہونے لگی اور قرآن کی جانب بازگشت کے ذریعے اُمت میں بیداری پیدا کرنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ اس دور کے اکثر مسلمان

رہنماؤں نے استبداد اور استعمار کے مقابلے میں مسلمانوں کو استقامت اور قیام کرنے کا سب سے پہلا قدم قرآن کی تعلیمات کی طرف پلٹنے کو قرار دیا۔(2)

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو اس سلسلے میں سب سے جامع اور محکم آواز سید جمال الدین اسد آبادی المعروف جمال الدین افغانی کی تھی جنہوں نے وحدت مسلمین کے قرآنی نظریہ کو احیاء کرنے کی جد وجہد شروع کی اور اتحاد بین المسلمین کے ذریعے ایک جامع دینی نظام تشکیل دینے کی کوشش کی۔ سید جمال الدین اسد آبادی مرحوم کی تمام تقریروں اور تحریروں نیز اصلاحی اقدامات میں قرآن کے سائے میں وحدت واتحاد بین المسلمین کی دعوت نظر آتی ہے جس کے لئے اُن کے جاری کردہ جریدے ''عروۃ الوثقی '' کی فائلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔اُنھوں نے اندرونی استبداد اور بیرونی سامراج کے خلاف مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے قرآنی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا اور اُمت مسلمہ کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ سید جمال نے اس مقصد کے لئے پورے عالم اسلام کا سفر کیا اور قرآنی تعلیمات کی برکت سے وہ جہاں بھی جاتے تھے، مسلمانوں میں انقلابی افکار پیدا کردیتے تھے۔

قرآن کو مہجوریت سے نکالنے اور کتاب الٰہی کی طرف مسلمانوں کی بازگشت کی یہ تحریک گذشتہ چند دہائیوں تک جاری رہی ؛اگرچہ علمی اور نظریاتی لحاظ سے یہ تحریک دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصے کو متاثر کرتی رہی ہے اور برصغیر،افغانستان،ایران،مصر،ترکی،شام،لبنان سے لے کر مصر اور شمالی افریقہ تک مسلمان عوام قرآن کی طرف بازگشت کی اس تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں؛لیکن عملی اور سیاسی واجتماعی میدان میں اس تحریک کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا یہاں تک کہ چودھویں صدی کے شروع میں ''مکتب امام خمینیؒ'' نے قرآن کو صدیوں پرانی مہجوریت ، تنہائی اور کسمپرسی سے نکالنے کے لئے کمر ہمت باندھی اور احیائے اسلام وقرآن کی تحریک نے پوری دنیا کے سیاسی اعداد وشمار میں تحول برپا کردیا۔

معاصر علمی ،سیاسی اور دینی شخصیات میں حضرت امام خمینیؒ وہ منفرد شخصیت ہیں جنہوں نے اُمت مسلمہ کی قرآن کی طرف بازگشت کے لئے سنجیدہ جد وجہد کی ہے اور آج اُن کی اس جد وجہد کے ثمرات علمی و عملی میدان میں نظر آرہے ہیں۔حضرت امام اُمتؒ نے عصر حاضر کی طاغوتی قوتوں کے خلاف جو قیام کیا اور اسلامی انقلاب برپا کیا ہے،اس کے علمی مبادیات اور نظریات قرآن مجید ہی سے لی گئی جو لوگ اسلامی

انقلاب کی سیاسی اور علمی تاریخ سے آگاہ ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس انقلاب نے بہت سی قرآنی اصطلاحات کا احیاء کیا ہے اور قرآنی فرہنگ کو مسلمانوں کے درمیان زندہ کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس وقت طاغوت، جہاد، مستضعفین، مشرکین سے برائت، توحید، حزب اللہ اور شہید و شہادت جیسے بیسیوں قرآنی مفاہیم مسلمانوں کے درمیان زندہ ہو چکے ہیں؛ جن سے سوائے دینی علوم سے آشنا لوگوں کے عام مسلمان بے خبر تھے یا بے توجہی کا شکار تھے لیکن اسلامی انقلاب کے بعد دنیائے اسلام کا بچہ بچہ ان قرآنی مفاہیم کی طرف متوجہ نظر آتا ہے، حتیٰ دشمنان اسلام بھی حقیقی مجاہدین اسلام کی جدوجہد کو غیر مؤثر بنانے کے لئے جہاد جیسے قرآنی مفہوم کا من پسند معنی استعمال کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں، جس کی واضح مثالیں، القاعدہ، طالبان اور اب داعش جیسے جہادی گروہوں کا وجود ہے جو دشمنان اسلام اور عالمی طاغوت کے مفادات میں قرآنی مفاہیم کو مسخ کرکے پیش کر رہے ہیں۔

حضرت امام خمینیؒ کی تمام تر سیاسی جدوجہد قرآن کے احیاء اور قرآنی ثقافت کو زندہ کرنے کے لئے تھی جس کا اظہار اُنھوں نے اپنی انقلابی تحریک کے دوران ہر تحریر و تقریر اور گفتگو میں کیا ہے، یہاں ہم نے امام اُمت کے انہی بیانات اور فرامین کو جمع کرنے کی سعی ہے جن میں اُنھوں نے قرآن کے احیاء کی بات کی ہے اور اُمت مسلمہ کے درمیان قرآن کے مہجور اور تنہا ہونے کا مرثیہ پڑھا ہے۔ امام اُمت نے ہر مقام اور ہر موقع پر قرآن کی کسمپرسی کی فریاد بلند کی ہے اور مسلمانوں کو قرآنی تعلیمات کی طرف لوٹنے کی تاکید کی ہے، اس سلسلے میں امام اُمت کے ایک ایک کلمے سے درد و رنج جھلکتا ہوا نظر آتا ہے اور امامؒ اُمت مسلمہ کی موجودہ ناگفتہ بہ حالت کا سب سے بڑا سبب مسلمانوں کی قرآن سے بے اعتنائی قرار دیئے ہیں۔

قرآن و اہل بیتؑ کی تنہائی

حضرت امامؒ پیغمبر اسلام ﷺ کی اُس وصیت پر ایمان راسخ رکھتے ہیں کہ جس میں پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی اُمت کو اپنے بعد ''ثقلین'' یعنی قرآن اور عترت اہل بیتؑ سے تمسک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں امامؒ اپنے سیاسی والٰہی وصیت نامے میں ایک مقام پر فرماتے ہیں:

> ''میں اس مقام پر مناسب سمجھتا ہوں کہ ''ثقلین'' کے بارے میں تذکّر دوں؛ لیکن ان کے غیبی، معنوی اور عرفانی مقامات کی حیثیت سے نہیں، کیونکہ میرا اور مجھ جیسے افراد کا قلم ان امور کے بیان سے عاجز ہے کہ میں ''ثقلین'' کے عالم وجود میں ملک سے ملکوت اعلیٰ تک اور وہاں

سے لاہوت تک پھیلے ہوئے عرفان کے ایک درجے کے بارے میں لب کشا کی جسارت کروں کہ جن کا فکر وخیال میں بھی تصور محال ہے اور ان کا تحمل سنگین اور طاقت فرسا؛ بلکہ ممنوع ہے اور نہ ہی میں '' ثقل اکبر''(قرآن) اور '' ثقل کبیر'' (اہل بیتؑ) کے حقائق کو لوگوں سے پوشیدہ اور تنہا رہ جانے کے بعد بشریت پر گزرنے والے واقعات بیان کرنا چاہتا ہوں۔

یہ '' ثقل کبیر'' تمام چیزوں سے بڑی ہے سوائے '' ثقل اکبر'' کے، کہ جو اکبر مطلق (سب سے بڑا) ہے اور نہ ہی خدا کے دشمنوں اور طاغوتی طاقتوں کے ہاتھوں ان دونوں ثقل پر گزرنے والے واقعات کو بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ جیسا کم علم انسان ان کے شمار سے عاجز ہے اور نہ ہی دامن وقت میں گنجائش ہے؛ بلکہ میں نے مناسب جانا کہ ان دونوں '' ثقل'' پر جو کچھ گزرا ہے اسے بطور خلاصہ مختصر انداز میں بیان کروں۔

شاید یہ جملہ (لَنْ یَفْتَرِقا حَتّیٰ یَرِدا عَلَیَّ الْحَوض) اسی جانب اشارہ ہو کہ رسول اکرم ﷺ کے بعد ان دونوں میں سے ایک پر جو گزری ہے وہی دوسرے پر بھی گزری ہے اور معاشرے میں ایک کی تنہائی دراصل دوسرے کی تنہائی اور کسمپرسی ہے یہاں تک کہ یہ دونوں ''حوض کوثر پر'' رسول اللہ ﷺ کے پاس لوٹ آئیں گے۔ کیا یہ کثرت کا وحدت سے ملنے کا حوض اور قطروں کا دریا میں ضم ہونا ہے یا کوئی اور چیز کہ وہاں تک انسان کی عقل وعرفان کو رسائی حاصل نہیں؛ پس یہ کہنا چاہیے کہ رسول اکرم ﷺ کی ان دو نشانیوں پر طاغوتی طاقتوں کی طرف سے جو ظلم وستم ہوا وہ صرف امت مسلمہ پر نہیں بلکہ پوری بشریت پر ہوا ہے کہ قلم ان سب کو بیان کرنے سے قاصر ہے۔'' (3)

رسول اکرمؐ کے بعد قرآن کا حال

اہل بیت اطہارؑ کے بعد قرآن مجید کی مہجوریت اور کسمپرسی کا مرثیہ پڑھتے ہوئے امامؑ اپنے وصیت نامے میں لکھتے ہیں: ''اب دیکھئے کہ کتاب خدا اور پیغمبر اکرم ﷺ کی اس نشانی پر کیا گزری؟ ایسے افسوسناک واقعات کہ جن پر دل خون کے آنسو روتا ہے، حضرت علی ؑ کی شہادت کے بعد ہی شروع ہوگئے۔ خودخواہ، طاغوتی اور سرکش افراد نے قرآن کریم کو قرآن کے خلاف قیام کرنے والی حکومتوں تک پہنچنے کیلئے وسیلہ بنالیا۔

قرآن کے حقیقی مفسّرین اور حقائق سے آشنا افراد کو کہ جنہوں نے پوری حقیقت قرآن کو رسول اکرم ﷺ سے حاصل کیا تھا اور ندائے (اِنّی تارِك فِیْكُمُ الثِّقْلَین) ان کی سماعتوں میں گونج رہی تھی، مختلف بہانوں اور پہلے سے تیار شدہ سازشوں کے ذریعے معاشرے سے دور کر دیا اور در حقیقت قرآن ہی کے ذریعے قرآن کو زندگی سے نکال دیا جو حوض کوثر تک بشریت کی رسائی کے لئے مادی اور معنوی زندگی کا سب سے عظیم دستور تھا اور آج بھی ہے۔ اسی طرح حکومت اسلامی پر جو اس مقدس کتاب کے اہداف میں سے ایک ہدف تھا اور آج بھی ہے، خط بطلان کھینچ دیا اور دین خدا، قرآن اور قرآن کے قانون وروش سے انحراف کی بنیاد رکھی یہاں تک کہ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ قلم انہیں بیان کرنے سے شرمندہ ہے۔

ٹیڑھی وکج بنیاد پر کھڑی کی گئی دیوار جتنی بھی بلند ہوتی رہی اس کی کجی وٹیڑھے پن میں اضافہ ہی ہوتا رہا یہاں تک کہ اس قرآن کریم کو اس طرح معاشرے سے نکال دیا گیا کہ جیسے اس کا ہدایت سے کوئی کام ہی نہ ہو، یہ قرآن جو اس عالم کے رہنے والوں کے رشد اور مسلمانوں؛ بلکہ تمام بشریت کو جمع کرنے کے لئے خداوند عالم کے مقام احدیت سے رسول اکرم ﷺ کے کامل مکاشفہ کے نتیجے میں نازل ہوا تاکہ تمام بشریت کو ان کی منزل مقصود تک پہنچائے، ''عِلمُ الاسماء'' کے اس فرزند کو شیاطین اور طاغوتوں کے شر سے نجات دے، جہان کو عدل وانصاف سے پر کرے اور حکومت کو حضرات معصومین کے ہاتھوں میں تھمادے تاکہ وہ انسانیت کی بہتری واصلاح کو ان تک پہنچادیں۔

مگر نوبت یہاں تک پہنچی کہ قرآن ظالم وجابر حکومتوں اور طاغوتی افراد سے زیادہ بدتر خبیث علما سوء کے ذریعے ظلم وستم کرنے اور ظالموں اور حق کے دشمنوں کے افعال کی توجیہہ کے لئے استعمال ہونے لگا، بہت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ حیلہ باز دشمنوں اور قرآن کے نادان دوستوں کے ہاتھوں تقدیر وسرنوشت ساز اس قرآن کو قبرستانوں اور ایصال ثواب کی مجالس میں صرف فاتحہ خوانی وتلاوت کے لئے رکھ دیا گیا اور آج بھی اس کی یہی حالت ہے، وہ قرآن کہ جسے مسلمانوں اور بشریت کے اتحاد کا مرکز اور ان کی زندگی کا آئین اور دستور ہونا چاہیے تھا، اختلاف وتفرقہ کا باعث بن گیا یا اسے معاشرے ہی سے نکال دیا گیا۔

ہم نے خود دیکھا کہ اگر کوئی حکومت اسلامی کا لفظ بھی زبان پر لاتا اور اسلام اور سول اکرم ﷺ کی بنیادی تعلیم ''سیاست'' کی بات کرتا کہ قرآن وسنت میں جس کا کثرت سے تذکرہ کیا گیا ہے تو گویا اس نے بہت بڑے گناہ اور ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''سیاسی مولوی'' کے کلمہ کو ''بے دین مولوی'' کے مترادف سمجھا جانے لگا اور اب بھی یہی صورتحال ہے۔''(4)

ہمارے زمانہ میں قرآن کی حالت

قرآن کی حقیقت اور تعلیمات کے خلاف قائم ہونے والی بعض نام نہاد مسلمان حکومتیں، ہمیشہ سے قرآن کے ظاہر کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتی رہی ہیں جس کی تاریخی مثالیں بنی اُمیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کی شکل میں دیکھی جاسکتی ہیں اور جس کی حالیہ مثالیں شہنشاہ ایران اور سعودی حکمران ہیں جو بظاہر قرآن کے نام پر حکومت کرتے رہے ہیں مگر درحقیقت قرآنی تعلیمات اور آیات کو اپنے پاؤں کے نیچے روندتے رہے ہیں۔ ایران کی ستم شاہی تو امام خمینیؒ کی جدوجہد کے نتیجے میں نابود ہو چکی ہے لیکن سعودی عرب کی ستم شاہی آج بھی قرآن کے نام قرآن ہی کی تعلیمات کے بخیئے اُدھیڑ رہی ہے۔اس سلسلے میں حضرت امام خمینیؒ نے آج سے پینتیس سال پہلے مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے اور سعودی عرب کے قرآن سے ظاہری لگاؤ کا پردہ چاک کرتے ہوئے فرمایا ہے:

" اور کچھ مدت قبل شیطانی طاقتوں نے اسلامی تعلیمات سے منحرف حکومتوں کے وسیلے سے خود کو جھوٹے طریقے سے اسلام سے منسوب کرلیا ہے۔ اسلام سے منحرف یہ حکومتیں قرآن کو محو کرنے اور شیطانی طاقتوں کے مذموم مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے قرآن کو خوبصورت اور زیبا شکل میں چھاپتی اور دوسرے ممالک ارسال کرتی ہیں اور اس طرح اپنے شیطانی حیلہ وفریب سے قرآن کو عملی زندگی سے نکال رہی ہیں۔

ہم نے خود اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ محمد رضا خان پہلوی نے قرآن چھاپ کر کچھ لوگوں کو اپنے مذموم مقاصد سے غافل کردیا تھا اور اسلامی تعلیمات سے بے خبر بعض مولوی بھی اس کے مداح اور ثناخواں ہوگئے تھے، آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ شاہ فہد لوگوں کی کثیر دولت کو ہر سال کثیر تعداد میں قرآن چھاپنے اور قرآنی تعلیمات کے خلاف تبلیغ کرنے میں مصروف ہے، وہ خرافات سے پُر اور بے بنیاد فرقۂ وہابیت کی ترویج اور غافل قوموں کو استکباری طاقتوں کی غلامی

کی طرف کھینچ رہا ہے اور ساتھ اسلام وقرآن کی نابودی کے لئے اسلام وقرآن ہی سے مدد لے رہا ہے۔"۔(5)

حضرت امام خمینیؒ جیسے دور اندیش لیڈر کی یہ باتیں آج پوری طرح روشن ہوچکی ہیں اور پوری دنیا کے باشعور مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ حرمین شریفین کے نام نہاد خادم کس طرح اُمت مسلمہ کے خون سے ہولی کھیلنے والوں کے پشت پناہ بنے ہوئے ہیں، اسرائیل کے فلسطینی مسلمانوں پر مظالم ہوں یا شام وعراق میں عالمی سامراج سے وابستہ دہشت گروہ، سب کی پشت پناہی یہی سعودی حکمران کر رہے ہیں جو ہر سال حاجیوں میں قرآن کے خوبصورت نسخے تقسیم کرتے ہیں لیکن طاغوت سے دوستی اور مظلوموں کی پشت پناہی کے سلسلے میں پوری طرح قرآنی تعلیمات کے برعکس عمل کر رہے ہیں۔

قرآنی قوانین کا دنیا میں عملی نفاذ نہ ہونا

حضرت امام خمینیؒ نے اپنی سیاسی اور الٰہی تحریک کے آغاز سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھے جانے والے سیاسی والٰہی وصیت نامے تک مہجوریت قرآن کے اندیشے کا اظہار کیا ہے اور اس قرآن کی اس مہجوریت اور کسمپرسی کے مختلف پہلوؤں کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی ہے اور اس کے بارے میں اپنی علمی کتابوں اور بیانات میں تحقیق کی ہے، لیکن ان سب بیانات اور تحریروں میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے وہ حضرت امامؒ کی قرآن کی اجتماعی اور سیاسی تعلیمات کی طرف خصوصی توجہ ہے۔

امامؒ اس سلسلے میں قرآن کے اجتماعی اور سیاسی پہلو سے مسلمانوں کی غفلت کا شکوہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اُن کے خیال میں کیا مسلمان اس الٰہی کتاب کو ایک پاک وپاکیزہ غلاف میں رکھ کر یا مردوں کے لئے ثواب کی خاطر تلاوت کرکے اور اس سے استخارہ کے وقت اس کو چوم کر اس کو مہجوریت اور تنہائی سے نکال لیتے ہیں اور اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی شکایت سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں؟!

اس سلسلے میں امامؒ کے اپنے بیانات کو پڑھنے سے ان کے حقیقی درد کو سمجھا جاسکتا ہے؛ چنانچہ امامؒ قرآن کی مہجوریت کے بارے میں فریاد بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اے قرآن! اے آسمانی تحفے اور اے خدائے رحمٰن کے ہدیے! خداوند عالم نے تم کو ہمارے دلوں کو زندہ کرنے اور ملتوں کی آنکھوں اور کانوں کو عبرت حاصل کرنے کے لئے نازل کیا

ہے، تم ہمارے لیے نور ہدایت اور سعادت کے راہنما ہو، تم ہمیں پست حیوانی درجات سے انسانیت کی بلندی اور خدائے رحمٰن کی بارگاہ تک لے جانا چاہتے ہو، افسوس کہ بنی نوع انسان نے تمہاری قدر کو نہیں جانا اور تمہاری پیروی کو اپنے اوپر فرض شمار نہیں کیا، افسوس صد افسوس کہ تمہارا قانون دنیا میں نافذ نہ ہو سکا؛ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان انسان نما وحشی درندوں کا یہ تنگ وتاریک گھر بہشت بریں بن جاتا اور جو خود کو دنیا کے متمدن اور تعلیم یافتہ انسان کہتے ہیں، سعادت وخوش بختی ان کے دامن میں اسی جہان میں جمع ہو جاتی۔" (6)

قرآن سے دوری اور اسلامی حکومتوں کا خسارہ

اس وقت اکثر مسلمان ممالک میں غیر مسلم قوانین پر عمل ہو رہا ہے جبکہ ہم دین اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات سمجھتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی الٰہی کتاب قرآن مجید میں ہر چیز کے بارے میں قانون اور ضابطہ موجود ہے؛ لیکن اس کے باوجود ہم اس سے غافل ہیں اور قرآن سے دوری اختیار کئے ہوئے ہیں، نہ تو قرآن کے قانون قصاص پر عمل ہوتا ہے اور نہ ہی قانون وراثت پر، کہیں بھی ملکی دفاع اور جہاد میں قرآنی تعلیمات کو مد نظر نہیں رکھا جاتا، قرآن ہمیں مظلوموں کی فریاد رسی کا واضح حکم دیتا ہے؛ لیکن ہمارے حکمرانوں کے سامنے مظلوم ذبح ہو رہے ہوتے ہیں وہ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں؛ البتہ قرآن سے دوری کا سب سے زیادہ نقصان انہی نام نہاد مسلمان حکومتوں کو ہوتا ہے چونکہ وہ قرآنی تعلیمات کے خلاف مظلوموں کی حمایت نہ کرنے کی وجہ سے بہت جلد نابود ہو جاتی ہیں اور اپنے طاغوتی آقاؤں کے سامنے ذلت وخواری اُٹھاتی ہیں، اس سلسلے میں امام خمینیؒ طاغوتی طاقتوں کے مسلمان ممالک پر تسلط کے بارے میں فرماتے ہیں:

"وہ کیوں مشرق پر قبضہ نہ کریں اور انہیں اپنا قیدی نہ بنائیں تاکہ اس کے ذریعے مشرق واہل مشرق کو مناسب قیمت پر فروخت کر سکیں، انہیں سونا بنالیں اور یہاں سے سونا لے جائیں؟ وہ کیوں اس کام کو انجام نہ دیں؟ ہماری اسلامی حکومتیں ان مطالب کی طرف متوجہ نہیں ہیں اور وہ اس بات سے بھی غافل ہیں کہ ان کے سر پر کیا بلائیں نازل ہونے والی ہیں؟ یہ تمام نقصانات قرآنی تعلیمات پر عمل نہ کرنے اور اسلامی قوانین کو نافذ نہ کرنے کی وجہ سے سامنے آرہے ہیں،

وہ اسلامی حکومتوں کو اختلاف و تفرقہ سے دن بدن کمزور سے کمزور تر کر رہے ہیں تاکہ دین ومذہب دونوں کو نعوذ باللہ نابود کر دیں۔

کیا اسلامی ممالک کے سربراہان، صدر، وزیر اعظم اور پارلیمان کے اراکین کو خواب غفلت سے بیدار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا یہ لوگ واقعی صورتحال کو نہیں جانتے؟ یا جانتے ہیں لیکن جاہ ومقام اور کرسی کی محبت نے انہیں مجبور کر دیا ہے کہ یہ لوگ ان دشمنوں کے دستور پر عمل کریں؟ آپ حضرات کو جاننا چاہیے کہ جو لوگ ان تمام واقعات سے مطلع ہیں یا مطلع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس ایک سادہ سے مطلب کو کہ جسے خمینیؒ نے سمجھ لیا ہے، وہ ابھی تک کیوں نہیں سمجھ سکے ہیں؟! آپ حضرات کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر انہوں نے واقعاً اس صورتحال کو سمجھ لیا ہے تو یا وہ خدانخواستہ بڑی طاقتوں کے جاہ وجلال میں کھوئے ہوئے ہیں یا پھر ان سے مرعوب اور خوفزدہ ہیں، آخر یہ خوفزدہ کیوں ہیں؟

اس لیے کہ ان کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور اتنی وسیع وعریض سلطنت عثمانیہ کو چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ان بے چاری اقوام اور کروڑوں پر مشتمل اس عظیم ملت (اسلامیہ) کو خدا سے غافل ایک گروہ کی قید میں ڈال دیا ہے جو ان کا استحصال کرتے ہیں اسلامی ممالک کے یہ سربراہ خود اپنی ہی اقوام کو بے چارہ بنا رہے ہیں، کیا ابھی بھی وقت نہیں آیا کہ یہ اسلامی حکومتیں خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں؟

انہوں نے اسلام سے ایسی کون سی بُری بات دیکھی ہے کہ ان کے لبوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟ مغرب سے مکر وحیلہ کی ایک موج بلندی ہوئی ہے کہ جس نے یا تو اسلامی حکومتوں کو اپنے پنجہ میں جکڑا ہوا ہے یا انہیں لالچ دی ہے یا دھمکی اور یہ وہ چیزیں ہیں کہ جس کا مشاہدہ ہم ان کے رسائل ومجلات، ان کے پروپیگنڈے اور ریڈیو کے پروگراموں سے کر رہے ہیں"۔(7)

مسلمانوں کی بدبختی کی وجہ قرآن سے دوری کو قرار دیتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ:

" اسلامی حکومتوں کی قرآنی تعلیمات سے دوری نے ملت اسلامی کو اس ذلت سے دوچار کیا ہے اور مسلمان اقوام کی تقدیر اور اسلامی ممالک کو دائیں بائیں بازو کی استعماری قوتوں کے مکر وفریب کی سیاست کا کھلونا بنا دیا ہے۔" (8)

پھر فرماتے ہیں :

"اسلام مسلمانوں کے لئے تمام چیزیں لے کر آیا ہے اور قرآن میں بھی تمام چیزیں موجود ہیں؛ لیکن صد افسوس کہ ہم مسلمانوں نے قرآن سے استفادہ نہیں کیا اور قرآن کو تنہا چھوڑ دیا ہے یعنی قرآن سے جس طرح فائدہ حاصل کرنا چاہیے تھا اس طرح نہیں کیا؛ لہٰذا لوگوں کو اس بات کی جانب توجہ دلانی چاہیے کہ وہ اسلام و قرآن کی جانب رغبت پیدا کریں۔"(9)

دین سے سیاست کی جدائی کا پروپیگنڈہ

حضرت امامؒ دین اور سیاست میں جدائی کو مسلمانوں کے خلاف سب سے بڑی سازش سمجھتے تھے، ایک شروع دن سے ہی عالمی سامراج کی طرف سے اس منفی پروپیگنڈے کے بارے میں اُمت مسلمہ کو آگاہ کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں، ایک جگہ اپنے بیانات میں آپؒ فرماتے ہیں :

'' ان استعماری طاقتوں نے اپنی باتوں کا اس طرح پروپیگنڈا کیا کہ ہم علما پر بھی اس کا شدید اثر ہوا تھا کہ آپ صرف مدرسوں میں بیٹھ کر درس دیجیئے اور ملک کے منافع اور تقدیر ہمارے ہاتھوں میں سونپ دیں۔ آپ جا کر دینی مدارس کے ایک کونے میں بیٹھ کر سادہ زندگی گزاریں اور لوگوں کے لئے شرعی مسائل بیان کریں ؛البتہ ہر مسئلہ نہیں ! اگر ہم علما شرعی مسائل کو صحیح طرح بیان کرتے تو آج یہ حالت نہ ہوتی۔ ان لوگوں نے اسلام کے سیاسی، اجتماعی، جنگی اور حکومتی مسائل کے ابواب کو بند کر کے کنارے لگا دیا (کہ یہ مسائل تو حضرت حجتؑ سے مربوط ہیں وہ جب تشریف لائیں گے تو حکومت کریں گے اور یوں طہارت و نجاست، حیض و نفاس اور جنابت کے چند شخصی مسائل کو سامنے کر دیا)۔

اگر آپ قرآن کا مطالعہ کریں تو آپ اس میں سیاسی، جنگی اور دشمنان خدا کے قتل کے احکامات کو کثرت سے جا بجا ملاحظہ کریں گے۔ لیکن یہ استکباری طاقتیں کہتی ہیں کہ بہت اچھا، لیکن اب آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ حکومت اور عوام کا باہمی رابطہ کیسا ہو؟ قوم پر حکومت کے کیا فرائض ہیں اور حکومت کو کس طرح عمل کرنا چاہیے؟ ایک اسلامی حاکم اور پولیس و نگہبان کو کیسا ہونا چاہیے؟ ایک قاضی کی شرائط کیا ہیں؟ ان تمام باتوں سے آپ کا کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے''۔(10)

دین وسیاست کی جدائی کے نعرے کے ذریعے قرآن کے خلاف استعماری پروپیگنڈے کا پردہ چاک کرتے ہوئے ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

" ایک ارب آبادی پر مشتمل اسلامی حکومتیں کیوں استعماری طاقتوں کی غلام ہیں؟ یہ حکومتیں قدرتی وسائل اور معدنی ذخائر خصوصاً تیل سے مالامال ہیں جو ان استعماری طاقتوں کی شہ رگ حیات ہے، مسلمان جو قرآن کی حیات بخش تعلیمات اور رسول اکرم ﷺ کے سیاسی اور عبادت وبندگی خدا کے دستورات کے حامل ہیں، جو انہیں ''حبل خدا'' کو مضبوطی سے پکڑنے کی دعوت اور تفرقہ واختلاف سے پرہیز کرنے کا درس دیتے ہیں، مسلمان حرمین شریفین جیسے ملجأ وجائے پناہ رکھتے ہیں جو حیات رسول اکرم ﷺ میں بھی اسلامی سیاست وعبادت کا مرکز تھے اور آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی کافی مدت تک اسی خصوصیت کے حامل رہے۔

سیاست وعبادت کے انہی دو بڑے مراکز میں فتوحات اور سیاست کے منصوبے تیار اور صادر کیے جاتے تھے؛ لیکن ان استعماری طاقتوں کے وسیع تر پروپیگنڈے، مذموم مقاصد اور کج فہمی کی وجہ سے آج نوبت یہاں پہنچ گئی ہے کہ حرمین شریفین میں مسلمانوں کے سب سے اہم امر ''سیاسی واجتماعی مسائل'' کی بات کرنا جرم سمجھا جاتا ہے اور سعودی پولیس مسجد الحرام میں اور اس جگہ کہ جو حکم خدا اور قرآنی نص کے مطابق تمام انسانوں حتیٰ منحرفین کے لئے بھی جائے امن ہے، اپنے لمبے بوٹوں اور اسلحہ سے مسلمانوں پر حملہ کرتی ہے اور انہیں زدوکوب کرتی اور گرفتار کرکے زندان میں ڈال دیتی ہے۔" (11)

ایک اور مقام پر مسلمانوں کی مشکلات کا تذکرہ کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی مشکل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"مسلمانوں کی مشکلات بہت زیادہ ہیں لیکن ان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے قرآن مجید کو اپنی عملی زندگی سے نکال کر دوسرے پرچموں تلے پناہ لے رکھی ہے۔" (12)

قرآن کی اجتماعی اور سیاسی تعلیم دینے والی آیات سے دوری نے ہمیں سیاسی میدان میں دوسروں کا دست نگر بنا دیا ہے اور سیاسی علوم وفنون میں طاغوتی حکومتوں کے محتاج ہو چکے ہیں اور ہمارے سیاسی فیصلے بڑی طاقتیں کرتی ہیں۔اس سلسلے میں امام اُمتؒ کہتے ہیں :

'' ان شیطانی قوتوں نے اقوام عالم کے تمام مسائل کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر علما کا یہ طبقہ اپنی اپنی ملتوں کی پشت پناہی کے ساتھ سیاست میں داخل ہو جائے تو ان طاقتوں کو حتمی شکست کا سامنا کرنا پڑے گا، چنانچہ اس مسئلہ کے حل کے لئے انہیں کیا کرنا چاہیے؟ اس مسئلہ کے حل کی صرف ایک راہ ہے اور وہ یہ کہ عمومی طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دیں کہ اہل علم کا سیاست سے کیا جوڑ ہے، علما کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ اپنی عبا کو اپنے سروں پر ڈال لیں اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو جائیں، ظہر کے وقت جا کر نماز پڑھائیں اور اس کے بعد منبر پر جا کر لوگوں کے لئے فردی زندگی سے متعلق چند شرعی مسائل بیان کریں نہ کہ وہ مسائل جو سیاست اور مسلمانوں کی مشکلات سے متعلق ہوں اور وہی مسائل جو لوگوں میں معمولاً رائج ہیں صرف انہی کو بیان کیا جائے۔ اسی لیے فقہ کے دوسرے ابواب کو عملاً بند کر کے کنارے لگا دیا گیا تھا۔

ہاں! البتہ کتابوں میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن عملی زندگی سے ان کا دور دور کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اسی طرح قرآن کریم کی کثیر آیات کو بھی عملی زندگی سے نکال کر پھینک دیا گیا تھا۔ ہم سب بڑے احترام سے قرآن پڑھتے، عقیدت سے اسے چومتے اور اس کے بعد بھی طاق میں سب سے اونچی جگہ بڑے احترام سے اسے رکھ دیتے ہیں۔ قرآن کی اکثر آیات معاشرے، اجتماعی زندگی، سیاست، جنگ اور اسی طرح کے دیگر مسائل سے مربوط ہیں لیکن ہم نے انہیں فراموش کر دیا یعنی انہوں نے ہمیں اپنے پروپیگنڈے کے ذریعے مجبور کیا تھا کہ ہم انہیں فراموش کر دیں''۔(13)

مسلمانوں کے آپس میں اختلاف کی وجہ سے قرآن کی کسمپرسی

امام خمینیؒ مسلمانوں کے تفرقے اور اختلاف کو قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیتے ہوئے باہمی اختلافات کو قرآن سے دوری کی علامت قرار دیتے ہیں، وہ اس سلسلے میں اسلام اور قرآن کی مہجوریت کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' رسول اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ اسلام ابتدا میں بھی مظلوم تھا اور بعد میں بھی مظلوم ہوگا۔ آج میں چاہتا ہوں کہ اسلام کی مظلومیت کو آپ حضرات کے لئے بیان کروں۔ قرآن

شریف میں آپ پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے خداوند عالم سے شکایت کی ہے (اِنَّ قومِ اتَّخَذُوا هٰذا الْقُرآنَ مَهْجُوراً) (14) کہ میری قوم وامت نے قرآن کو نظرانداز اور تنہا کر دیا۔ آج میں اس قرآن کے نظرانداز ہونے، مسلمانوں کے درمیان اس کی تنہائی، اجنبیت اور مظلومیت کو آپ حضرات کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ آج مسلمانوں اور اسلام کی کیا حالت ہے؟ آج قرآن اور اسلام مسلمان معاشرے میں تنہا اور مظلوم ہیں اور انہیں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام وقرآن کی بنیادی تعلیمات کو یا تو سرے ہی سے نظرانداز کر دیا گیا ہے یا بہت سی اسلامی حکومتوں نے انہی تعلیمات کے خلاف قیام کیا ہے۔" (15)

امت مسلمہ کے ذریعے قرآنی احکام کی نظراندازی کے بارے میں ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

"آج اسلام، قرآن اور قرآنی احکامات مظلوم ہیں، انہیں نظرانداز اور معاشرے میں یکتا و تنہا کر دیا گیا ہے؛ اس معنیٰ میں کہ آپ باآواز بلند اذان کہتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی اسلام کے بہت سے سیاسی احکامات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اس طرح اسلام وقرآن کی تنہائی وکسمپرسی ختم نہیں ہوگی۔ قرآن جب کہتا ہے: (وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَ لَا تَفَرَّقُوا)1 (16) (وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُم)2 (17) یعنی اگر اسلام کے ان بلند پایہ احکامات پر عمل ہو تو دنیا پر حکومت کرنا تم مسلمانوں کا حق ہے لیکن تم سب نے قرآن کو یکتا و تنہا کر دیا ہے اور ان مسائل اور تعلیمات کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ (18)

قرآنی دعوت کی جانب مسلمانوں کی عدم توجہی کے متعلق فرماتے ہیں:

" کیا یہ مسلمانوں کے لئے مصیبت نہیں ہے کہ ہم اپنی تمام چیزوں کو اخلاص کے طبق میں سجا کر ان بیگانوں اور استعماری طاقتوں کی خدمت میں پیش کر دیں اور ان کی منت سماجت بھی کریں کہ وہ انہیں قبول کر لیں؟! جب اس بات کی نوبت آجائے کہ مسلمان خداوند عالم کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ جائیں، قرآنی تعلیمات اور اسلامی احکامات کی طرف توجہ نہ دیں اور اسلام کی اتحاد

---

1 ۔ (ترجمہ) اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

2 ۔ اور آپس میں مت جھگڑو کہ تم سست پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

بین المسلمین کی دعوت کو پامال کردیں تو ان کی یہی حالت ہونی چاہیے کہ اپنی تمام دولت کو ان بڑی طاقتوں کی خدمت میں پیش کریں اور ان سے التماس بھی کریں کہ جناب والا! آپ انہیں قبول کر لیجئے!! کیا ہمیں اب بھی خواب غفلت سے بیدار نہیں ہونا چاہیے؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان درس عبرت لیں؟ "(19)

قرآن حجابوں میں لپٹا ہوا ہے

حضرت امامؒ حج کو بھی قرآن کی مانند مظلوم قرار دیتے ہوئے قرآن مجید کی کسمپرسی کا ایک اور پہلو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حج بھی قرآن کی مانند ایک خزانہ ہے کہ جس سے تمام مسلمان بہرہ مند ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی مفکرین، دانشمند حضرات اور امت اسلامیہ کا درد رکھنے والے افراد اگر اس کے دریائے علم و معرفت میں غوطہ زن ہوں اور اس کے سیاسی واجتماعی احکامات کے نزدیک جانے اور اس میں غور و فکر کرنے سے خوف نہ کھائیں تو وہ اس دریا کے بہترین صدف، رشد وہدایت اور حکمت وآزادی کے نایاب اور بے نظیر گوہروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں حاصل کر سکیں گے اور اس کے حکمت و معرفت کے شفاف چشمے سے تا ابد سیراب ہو جائیں گے۔

لیکن کیا کریں اور اس غم کے سمندر کو کہاں لے جائیں کہ حج بھی قرآن کی مانند یکتا و تنہا اور غریب واجنبی ہے اور اسے بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جس طرح اس مکمل ضابطہ حیات اور کمال وجمال کی اس کتاب کو ہم نے خود ساختہ حجابوں اور پردوں میں لپیٹ دیا ہے، خلقت کے اس گنج اسرار کو اپنی کج فکری کی خاک میں دفن کر دیا ہے اور خدا سے انس وہدایت اور زندگی کی یہ زبان اور اس کا فلسفہ زندگی، وحشت اور قبر و موت کی زبان میں تبدیل ہو گیا ہے اسی طرح حج بھی آج اسی قسم کی آفتوں میں گرفتار ہے۔"(20)

اُمت مسلمہ کی قرآن سے بے اعتنائی اور خود پیروان قرآن کے درمیان قرآن کی مہجوریت اور تنہائی کے بارے میں حضرت امام خمینیؒ کے دردناک اظہارات سے پتا چلتا ہے کہ قرآن کی اس تنہائی سے وہ کس قدر رنجیدہ تھے اور ملت اسلامیہ کے تمام مسائل اور مشکلات کا سبب اسی بے توجہی کو سمجھتے تھے۔

لہٰذا حضرت امامؒ نے قرآن کو اس کسمپرسی اور تنہائی سے نکالنے اور اس کی فردی واجتماعی تعلیمات کو عملی شکل دینے کے عزم وارادے کے ساتھ اپنی اسلامی تحریک شروع کی اور سالہا سال کی جدوجہد کے بعد وہ اس قول کو عمل کی شکل میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔۱۹۷۹ء میں انقلاب اسلامی کی کامیابی اور اسلامی حکومت کا قیام درحقیقت حضرت امامؒ کے اُنہی قرآنی نظریات اور افکار کا عملی وجود تھا کہ جس کا اظہار وہ اپنی ہر گفتگو اور تحریر میں کرتے رہے تھے۔

حضرت امامؒ نے قرآنی تعلیمات کا اسلامی معاشرے میں عملی تجربہ کرنے کا جو ارادہ کیا تھا وہ اسلامی جمہوری ایران کی شکل میں ظاہر ہوا اور آج گزشتہ پینتیس سال سے اسلامی جمہوری ایران میں قرآن کی سیاسی واجتماعی تعلیمات اور قوانین کو اجراء کرنے کا تجربہ کیا جارہا ہے اور یہی امام اُمتؒ کی سب سے بڑی آرزو تھی، یہ آرزو نہ فقط امام خمینیؒ کی تھی بلکہ بانی اسلام حضرت پیغمبر اکرم ﷺ اور اُن کے برحق جانشینوں کی بھی یہی آرزو تھی کہ قرآن کی تعلیمات اسلامی معاشروں میں عملی شکل اختیار کرلیں جس کی خاطر تمام آئمہ معصومینؑ نے قربانیاں دیں اور جس کی خاطر کربلا جیسا دردناک واقعہ رونما ہوا اور جس کی خاطر صدر اسلام سے لے کر آج تک لاکھوں فرزندان قرآن نے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔

عصر حاضر میں قرآن کو مہجوریت اور تنہائی سے نکالنے والی تمام دینی شخصیات میں امام خمینیؒ وہ واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی سیاسی بصیرت اور ناقابل بیان شجاعت اور ایمان کے ذریعے قرآنی قوانین کو عملی شکل دینے اور اس راستے کی ہر مشکل کو ختم کرنے کا عملی تجربہ کیا ہے جو آج کے تمام مسلمانوں کے لئے نمونہ عمل ہے۔امام خمینیؒ نے ثابت کردیا ہے کہ قرآنی تعلیمات ہر زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہیں بشرطیکہ ان پر مکمل ایمان ویقین کے ساتھ عمل کیا جائے اس لیے کہ یہ الٰہی تعلیمات ہیں جو انسانوں کے خالق نے انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی ہیں۔

آخر میں اس بات کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ نہ تو حضرت امام خمینیؒ نے کبھی یہ دعویٰ کیا اور نہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اسلامی جمہوری ایران میں تمام قرآنی قوانین عملی شکل اختیار کرچکے ہی؛البتہ اس کے لئے مخلصانہ کوشش ضروری کی جارہی ہے۔چونکہ قرآن کو مکمل طور پر نافذ کرنے کے لئے جہاں قرآن کو قبول کرنے والوں میں ضروری ظرفیت اور صلاحیت ضروری ہے وہاں قرآنی قوانین کے اجراء کرنے والے مجری کے لئے بھی قرآن کی طرح معصوم ہونا ضروری ہے۔اس لئے ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کی

مکمل تعلیمات کا ایک معصوم الٰہی نمائندہ ہی اجراء کرسکے گا اور قرآن کو مکمل طور پر مہجوریت سے امام معصومؑ ہی نکال سکے گا؛البتہ اس کے لئے راہ ہموار کرنا اور انسانوں کو آمادہ کرنا ہمارا اولین فریضہ ہے، یہ وہی فریضہ ہے جس پر امام خمینیؒ نے عمل کرکے دکھایا ہے اور آج کے تمام انسانوں کے لئے نمونہ عمل پیش کیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ مترجم مفتی جعفر حسین، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۴۵
2۔ خرمشاہی، تفسیر و تفاسیر جدید، 20 - 22، تہران، کیہان، چاپ اول، 1364
3۔ صحیفہ امام، ج۲۱، ص۳۹۳، ۳۹۶
4۔ ایضاً، ص۳۹۵
5۔ صحیفہ امام، ج۲۱، ص۳۹۶
6۔ امام خمینی، کشف اسرار ص ۲۲۰
7۔ صحیفہ امام، ج۱، ص۳۷۷، ۳۷۶
8۔ ایضاً، ج۲، ص۴۳۸
9۔ ایضاً، ج۱۲، ص۳۲۰
10۔ ایضاً، ج۹، ص۱۷۷
11۔ ایضاً، ج۱۵، ص۲۹۰
12۔ ایضاً، ج۱۳، ص۲۷۵
13۔ ایضاً، ج۱۵، ص۱۱، ۱۰
14۔ سورۂ فرقان، آیت ۳۰
15۔ صحیفہ امام، ۱۶، ص۳۴، ۳۳
16۔ آل عمران، آیت ۱۰۳۔
17۔ انفال/۴۷۔
18۔ ایضاً، ج۱۶، ص۳۹، ۳۸
19۔ ایضاً، ج۱۸، ص۵۵
20۔ صحیفہ امام، ج۲۱، ص۷۸، ۷۷

حروف مقطعات (۱)

مختلف آراء کا تجزیاتی مطالعہ

ثاقب اکبر *

ukhuwat@gmail.com

کلیدی کلمات: تحدی، شان نزول، متشابہات، صحابہ کرام۔

خلاصہ

قرآن حکیم کی کچھ سورتوں کے شروع میں حروف مقطعہ اس طرح سے آئے ہیں کہ جن سے بظاہر کوئی لفظ نہیں بنتا اور انھیں الگ الگ کرکے حروف کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ بعض سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات ایک ایک، بعض میں دو دو، بعض سورتوں میں تین تین حروف آئے ہیں۔ اسی طرح بعض سورتوں کے شروع میں چار حروف اور بعض سورتوں کے شروع میں پانچ حروف پر مشتمل حروف مقطعات آئے ہیں ۔ قرآن حکیم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس میں حروف مقطعہ دکھائی دیتے ہیں۔ حروف مقطعہ سے بامعنی جملے بنانے کی کوشش کی بھی ایک تاریخ ہے۔ ہر کسی نے اس سلسلے میں جو بھی کوشش کی ہے وہ اپنے ذوق اور مذہب کے پیش نظر کی ہے۔ حروف مقطعات کے بارے میں مختلف اقوال ہیں اور بعض نے ایک سے زیادہ احتمالات بیان کیے ہیں۔ اس مقالے میں ان اقوال کا خلاصہ اور ان کے بارے میں مختلف آراء پیش کی گئی ہیں۔ جن کے مطابق ان مراد یہ ہے کہ (۱) یہ حروف متشابہات میں سے ہیں، (۲) حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں، (۳) یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں، (۴) یہ حروف فکر و عقل کے اول مخلوق ہونے کی طرف اشارہ ہیں ، (۵) یہ کہ حروف مقطعہ پیغمبر اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں یعنی، یہ حروف خبر دینے کے لیے ایک گھنٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (۶) یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخر میں مولانا مودودی کا یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ صحابہ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا اور پھر مولانا سلیم اللہ خان کی طرف مولانا مودودی کے نظریئے کا ردّ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

---

* ۔ صدر نشین البصیرہ، اسلام آباد۔

مقدمہ

قرآن حکیم میں 114 میں سے 29 سورتیں ایسی ہیں جن کے شروع میں حروف اس طرح سے آئے ہیں کہ جن سے بظاہر کوئی لفظ نہیں بنتا اور انھیں الگ الگ کرکے حروف کی صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے جیسے سورہ بقرہ کے آغاز میں الٓمّٓ اسے الف، لام، میم کی صورت میں ادا کیا جائے گا۔ اس سے پہلے کہ ہم حروف مقطعات کی حقیقت اور اس کے مطالب کی تفصیلی بحث میں وارد ہوں، قرآن حکیم میں حروف مقطعات کے حوالے سے چند ضروری معلومات پیش کرتے ہیں:

چند ضروری معلومات

1. بعض سورتوں کے آغاز میں آنے والے حروف مقطعات ایک ایک ہیں جیسے ن، ق وغیرہ۔ بعض میں دو دو ہیں جیسے حٰمٓ، یٰسٓ۔ بعض سورتوں میں تین تین حروف آئے ہیں جیسے الٓرٰ، الٓمٓ وغیرہ۔ اسی طرح بعض سورتوں کے شروع میں چار حروف آئے ہیں جیسے الٓمٓصٓ، الٓمٓرٰ اور بعض سورتوں کے شروع میں پانچ حروف پر مشتمل حروف مقطعات آئے ہیں جیسے سورہ مریم کے آغاز میں کٓھٰیٰعٓصٓ۔
2. قرآن حکیم میں جن سورتوں میں بھی یہ حروف آئے ہیں وہاں بسم اللہ کے بعد ہمیں انہی سے سابقہ پڑتا ہے؛ گویا یہ ہر جگہ سورت کے آغاز میں آئے ہیں، سورتوں کے بیچ میں اس طرح کے حروف ہر گز نہیں آئے۔
3. 29 سورتوں کی ابتداء میں آنے والے ان حروف کے بعد عام طور پر قرآن حکیم کی عظمت اور مقاصد کو بیان کرنے والی کوئی آیت آئی ہے، 24 سورتوں میں تو صراحت سے قرآن حکیم کا ذکر ہے اور دیگر سورتوں میں بھی کسی نہ کسی صورت میں وحی، رسالت اور کتاب وغیرہ کے حوالے سے ہی کوئی بات کی گئی ہے جو بالآخر قرآن حکیم سے مربوط ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم چند مقامات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○ يٰسٓ ○ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ○

وہ حروف مقطعات جن کے بعد واضح طور پر قرآن حکیم کا ذکر نہیں آیا ان کی ایک مثال سورہ مریم کی یہ آیات ہیں۔

كٓهٰيٰعٓصٓ O ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا O اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّاO

ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں حروف مقطعہ کے بعد وحی و نبوت کا ذکر کیا گیا ہے، دیگر وہ سورتیں جن میں حروف مقطعہ کے بعد صراحت سے قرآن حکیم کا ذکر نہیں آیا وہ عنکبوت، روم اور قلم ہیں۔

4. تاریخ نزول اور شان ہائے نزول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر مشرکین یا دیگر مخالفین نے حروف مقطعہ کے حوالے سے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس امر سے مفسرین نے مختلف نتائج اخذ کیے ہیں جن کا ذکر ہم آئندہ سطور میں کریں گے۔
5. قرآن حکیم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس میں حروف مقطعہ دکھائی دیتے ہیں، دیگر مقدس کتابیں جس حالت میں بھی ہیں ان میں اس طرح کے حروف دکھائی نہیں دیتے، گویا اس امر میں آسمانی کتابوں میں قرآن منفرد ہے۔
6. وہ 29 سورتیں جن کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں ان کے نام یہ ہیں: بقرہ، آل عمران، اعراف، یونس، ھود، یوسف، رعد، ابراھیم، حجر، مریم، طہ، شعرائ، نمل، قصص، عنکبوت، روم، لقمان، سجدہ، یسٓ، ص، مومن، فصلت، شوریٰ، زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، ق اور قلم۔
7. 29 سورتیں جن کے شروع میں حروف مقطعات آئے ہیں ان میں سے 2 مدنی اور باقی 27 مکی ہیں۔
8. بعض حروف مقطعات کا دیگر سورتوں میں تکرار ہوا ہے جب کہ بعض کا بالکل تکرار نہیں ہوا۔
9. مکررات کو حذف کر دیا جائے تو حروف مقطعہ 14 بنتے ہیں جو یہ ہیں: ا، ح، ر، س، ص، ط، ع، ق، ک، ل، م، ن، ہ، ی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف مقطعہ عربی زبان کے 28 حروف میں سے نصف ہیں۔

10. حروف مقطعہ سے با معنی جملے بنانے کی کوشش کی بھی ایک تاریخ ہے۔ ہر کسی نے اس سلسلے میں جو بھی کوشش کی ہے وہ اپنے ذوق اور مذہب کے پیش نظر کی ہے۔ چنانچہ حروف مقطعہ سے بنائے جانے والے اس جملے کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی ہے:

صراط علی حق نمسکه

اس کا مفہوم ہے: علی کا راستہ برحق ہے ہم اس سے تمسک رکھتے ہیں۔

حروف مقطعہ سے جملہ سازی کی اس روش پر تبصرہ کرتے ہوئے آیت اللہ جوادی آملی لکھتے ہیں:

این ویژگی گرچه لطیف است، لیکن دلیل معتبرآن را تایید نمی کند، افزون برآن که، با این گونه روشها نمی توان عقاید و مبانی دینی را اثبات کرد۔۔۔ صحیح است۔ (1) ما باید به گونه ای سخن بگوییم که نقدپذیرنباشد، سخنی که پشتوانه معقول یا منقول نداشته باشد با نقد مستدل به نحو نقض یا منع یا معارضه فرو می ریزد۔ (2)

یہ خصوصیت اگرچہ لطیف ہے لیکن دلیل معتبر اس کی تائید نہیں کرتی۔ مزید برآں ایسے طریقوں سے عقائد اور دینی بنیادوں کو بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ طریقہ کار قابل نقد ہے؛ لہٰذا آلوسی کہتے ہیں": یہ بات ظرائف میں سے ہے کہ شیعوں نے حضرت علیؑ کی خلافت کو ثابت کرنے کے لیے حذف مکررات کے بعد حروف مقطعات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ جملہ بنایا ہے"صراط علی حق نمسکه"۔ اہل سنت بھی اپنے طریقے کی تائید کے لیے اس طرح کے جملے بنا سکتے ہیں مثلاً: "صح طریقك مع السنه" یعنی سنت کے ساتھ تیرا راستہ صحیح ہے۔

ہمیں اس طرح سے بات کرنی چاہیے کہ جو قابل نقد نہ ہو۔ ایسی بات جس کی کوئی معقول یا منقول بنیاد نہ ہو وہ مستدل تنقید کے ساتھ نقض، منع یا معارضے کی صورت میں ختم ہو جاتی ہے۔

حروف مقطعات کے بارے میں مختلف اقوال

حروف مقطعات کے بارے میں مختلف علماء کے مختلف اقوال ہیں اور بعض نے ایک سے زیادہ احتمالات بیان کیے ہیں۔ ہم ذیل میں ان اقوال کا خلاصہ اور ان کے بارے میں مختلف آراء پیش کرتے ہیں۔

۱۔ یہ حروف متشابہات میں سے ہیں

یہ حروف قرآن حکیم کے متشابہات میں سے ہیں، ان کے معنی صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جیساکہ سورہ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ۔۔۔ (3)

متشابہات کی تاویل صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

ہمارے نزدیک مذکورہ بالا آیت کا یہ مفہوم نہیں ہے تاہم یہ مقام اس پر گفتگو کا نہیں ہے اس قول کے بارے میں بات کرتے ہوئے علامہ طبرسی کہتے ہیں:

"اختلف العلماء فی الحروف المعجمة المفتتحة ۔۔۔ قال: لله فی کل کتاب سر و سره فی القرآن سائر حروف الهجاء المذکور فی أوائل السور۔" (4)

وہ الگ الگ حروف جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان کے بارے میں علماء میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا کہنا ہے کہ یہ متشابہات ہیں جسے اللہ نے اپنے علم سے مختص کیا ہے اور اس کی تاویل کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ وہی بات ہے جو ہمارے آئمہ علیہم السلام سے بھی مروی ہے اور عامۃ المسلمین نے بھی امیر المومنین علیؑ سے اسے روایت کیا ہے کہ آپؑ نے یہ فرمایا کہ ہر کتاب کا ایک نچوڑ ہوتا ہے اور اس کتاب کا نچوڑ یا اعلیٰ ترین چیز یہ حروف تہجی ہیں اور شعبی سے روایت ہے کہ آپؑ نے فرمایا ہر کتاب میں اللہ کا بھید ہے اور قرآن میں اللہ کا بھید یہ حروف مقطعہ ہیں جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔

۲۔ حروف مقطعہ سورتوں کے نام ہیں

حروف مقطعات جن سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں یہ ان کے نام ہیں اور جن سورتوں میں مشترک حروف مقطعہ آئے ہیں وہ ان کا مشترک نام ہے۔ علامہ طبرسی کہتے ہیں کہ یہ حسن اور زید بن اسلم کا نظریہ ہے۔ (5)

اس سلسلے میں مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ یسٓ، طٰہٰ، ص اور ق میں سے ہر کوئی سورتوں کے نام ہیں۔ بعض سورتوں کے نام متعدد ہیں جن میں سے ایک نام حروف مقطعہ کی مناسبت سے ہے؛ اگرچہ متقدمین اور متاخرین میں سے بہت سے مفسرین نے اس نظریے کو اختیار کیا ہے تاہم عصر حاضر میں سر سید نے

اسی نظریے کو اختیار کرتے ہوئے اسے شرح و بسط سے بیان کیا ہے کہ ہم ذیل میں اسے نقل کرتے ہیں۔

سرسید کا نظریہ

سرسید اپنی تفسیر القرآن میں ''الٓمّٓ'' کی تفسیر کے ضمن میں لکھتے ہیں: (الٓمّٓ) یہ سورت انہی انتیس سورتوں میں سے ہے جن کو خود خدا نے ان کے نام سے موسوم کیا ہے، یہ حروف مقطعات ان سورتوں کے نام ہیں جن کی ابتدا میں آئے ہیں اور جو سورتیں باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہیں ان کے ایک ہی سے نام مقرر کیے ہیں، اب یہاں تین باتیں غور طلب ہیں، ایک یہ کہ انہی انتیس سورتوں کے نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے؟ دوسرے یہ کہ حروف مقطعات سے کیوں ان کے نام مقرر کیے ہیں؟ تیسری یہ کہ جن حروف مقطعات سے ان سورتوں کے نام مقرر کیے ہیں، انہی حروف سے ان کا نام مقرر کرنے کا کیا سبب ہے؟

قرآن مجید پر غور کرنے سے علانیۃ پایا جاتا ہے کہ جس سورت کو خدا تعالیٰ نے طور پر یا اس طرز کلام پر شروع کیا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے یا یہ خدا کی کتاب ہے، اس مقام پر خدا نے اس سورت کو کسی اسم سے موسوم کیا ہے تاکہ اس کا نام لینے سے اس کے مسمیٰ پر اس امر کا اطلاق ہو جس کا اطلاق کرنا منظور ہے اور جن سورتوں کو اس طرز کلام سے شروع نہیں کیا ان کا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مثلاً اس سورت کا نام جس کی ہم تفسیر کر رہے ہیں (الٓمّٓ) ہے،

اب خدا تعالیٰ نے طرز کلام اس طرح پر شروع کیا ہے کہ یہ سورت خدا کی کتاب کی ہے، تو اس نے اس سورت کا نام لے کر کہہ دیا کہ الٓمّٓ یعنی اسکا مسمیٰ وہ کتاب ہے؛ پس جو الٓمّٓ اس سورت کا نام ہے مبتدا اور ذلك مبتدا ثانی ہے اور الکتاب اس کی خبر ہے اور یہ مبتدا و خبر مل کر پہلے مبتدا کی خبر ہیں اور الٓمّٓ یعنی الم کا مسمیٰ ذلك الکتاب پر محمول ہے۔

یہ امر بھی واضح ہے کہ اگر ان سورتوں کے نام الفاظ با معنی سے مرکب ہوتے تو ان معنوں کا جن پر وہ الفاظ دلالت کرتے، ''ذلك الکتاب'' پر حمل ہونے کا شبہ پڑتا اور معنی سے ہٹ کر اس کے مسمیٰ کا محمول ہونا بہت کم خیال میں جاتا؛ پس خدا تعالیٰ نے حروف مقطعہ کو جو ترکیب کلام کے اصول بھی ہیں اور معانی سے مبرا بھی ہیں اسماء سورہ اختیار کیا تاکہ بجز مسمیٰ کے محمول ہونے کے اور کوئی احتمال ہی نہ رہے۔

البتہ اس بات کا تصفیہ کہ ان حروف کو اس سورہ کے نام کے لیے کیوں مخصوص کیا؟ مشکل ہے دنیا میں بھی جو شخص کسی کا کچھ نام رکھتا ہے اور جو مناسبت یا علت اس نام رکھنے کی اس کے دل میں ہوتی ہے، اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے؛ پس یہ قرار دینا کہ خدا نے اس مناسبت سے ان حروف مقطعات سے اس سورت کو موسوم کیا ہے، ایک مشکل امر ہے اور ضروری ہے کہ علما کے درمیان اس میں اختلاف ہو، چنانچہ بہت سا اختلاف ہوا بھی ہے، یہاں تک کہ بعضوں نے کہا کہ اس مناسبت کا علم خدا ہی کو ہے مگر ہر شخص بقدر اپنی فہم کے اس مناسبت کے بیان کرنے کا بلاشبہ مجاز ہے۔

میری سمجھ یہ ہے کہ بعض اہل عرب حروف مقطعات بولتے تھے اور اس سے اشارہ کسی مطلب کی طرف ہوتا تھا جیسے کہ اس شعر میں ہے:

قلت لها قفی فقالت لی ق　　لاتحتسبی انا نسینا الایجاف

یعنی میں نے اس سانڈھنی سوار عورت سے کہا کہ ٹھہر جا، یہ مت خیال کر کہ میں سانڈھنی ہنکانا بھول گیا ہوں۔ اس نے کہا کہ قاف یعنی وقفت ٹھہر گئی؛ میں حرف قاف سے پورا کلام ''وقفت'' کا مراد ہے۔

سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران اور سورہ عنکبوت اور سورہ روم اور سورہ لقمان اور سورہ سجدہ، ان سب کے سرے پر الٓمٓ ہے جو ان سورتوں کا نام ہے۔

ان تمام سورتوں میں خدا تعالیٰ نے احکام الٰہی کی تعمیل اور امر بالمعروف کی تاکید اور لیل و نہار کے اختلاف اور عالم میں جو آیات قدرت کردگار ہیں ان سے خدائے واحد کے وجود پر استدلال کیا ہے اور موت کا اور اس کے بعد کے حالات کا بیان فرمایا ہے اور اسی سبب سے الٓمٓ سے ان سورتوں کو موسوم کیا ہے تاکہ ان تینوں حروف سے ان مطالب عظیمہ کی طرف اشارہ ہو اور انہی مطالب عظیمہ کا ذکر ان سب سورتوں میں تھا، اس لیے ان سب کو ایک ہی نام سے موسوم کیا۔

علماء اسلام نے رفع التباس کے لیے ان سورتوں کے نام کے ساتھ جن کے متحد نام تھے یا جن میں حروف مقطعات زیادہ تھے یا کسی سورت کے اہم مضمون پر زیادہ وضاحت سے اشارہ کرنے کی غرض سے اور نیز ان سورتوں کے لیے جو کسی نام سے موسوم نہ تھیں؛ اسے یہودی قاعدہ کے مطابق اسی سورت میں سے کسی لفظ اس سورت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے منتخب کیا جو رفتہ رفتہ بطور ان سورتوں کے نام کے

متصور ہونے لگے مگر در حقیقت یہ وہ الفاظ ہیں جو علماء نے ان سورتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے اختیار کیے ہیں۔(6)

شیخ طوسی کا نظریہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین میں سے بھی ایک رائے بیان کر دی جائے، شیخ طوسی نے اس نظریے کو حروف مقطعہ کے بارے میں دیگر نظریات پر ترجیح دی ہے، وہ کہتے ہیں:

واحسن الوجوہ التی قبلت قول من قال: انها اسماء للسور خص الله تعالیٰ بها بعض السور بتلك كما قيل للمعوذتين: المقشقشتان ، أی تبرء ان من النفاق، وكما سميت الحمد أم القرآن و فاتحة الكتاب۔ ۔۔ فاوجب فی الأشخاص أن يكون الاسم غير المسمى ولم يوجب فی غيرها۔۔۔(7)

حروف مقطعہ کے بارے جو وجوہ بیان کی گئی ہیں ان میں سب سے بہتر وہ ہے جو میں نے قبول کی ہے اور وہ ہے یہ کہنے والے کا قول کہ یہ سورتوں کے نام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے بعض سورتوں کو مختص کیا ہے جیسے معوذتین کو المقشقشتان کہا گیا ہے یعنی نفاق سے بیزار دو سورتیں اور جیسے الحمد کو ام القرآن اور فاتحۃ الکتاب کہا گیا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ دو یا تین سورتوں کا ایک نام نہ ہو جیسے بہت سارے افراد کا ایک نام ہوتا ہے اور جب زید کو پہچاننا چاہیں تو اسے اس کی صفت کے ذریعے سے پہچانیں گے اور جب کسی سورۃ کو پہچاننا چاہیں گے تو یوں کہیں گے الم ذلك، الم الله، الم وغیرہ۔

کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ یہ کہے کہ یہ سورتوں کے نام کیسے ہو سکتے ہیں؟ جبکہ اسم کو غیر مسمّٰی ہونا چاہیے پس ضروری ہے کہ یہ حروف سورہ میں سے نہ ہوں اور یہ خلاف اجماع ہے، کہا گیا ہے یہ ممنوع نہیں ہے کہ کسی چیز کا نام خود اسی کے کسی حصے سے ہو، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ (بعض سورتوں کو) البقرۃ، و آل عمران، والنساء، والمائدۃ کہتے ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں، حالانکہ یہ الفاظ خود سورتوں کا حصہ ہیں۔ اس مسئلے میں اشخاص اور غیر اشخاص میں فرق ہے۔ اشخاص کے لیے ضروری ہے کہ ان کا نام غیر مسمّٰی ہو لیکن غیر اشخاص کے لیے یہ بات ضروری نہیں ہے۔

۳۔ یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں

یہ حروف پورے قرآن کے نام ہیں جیسے ذکر، فرقان وغیرہ قرآن کے نام ہیں۔ علامہ طبرسی کے مطابق قتادہ کا یہی نظریہ ہے۔ شیخ طوسی نے التبیان میں اس رائے کے بارے میں کہا ہے: فقال بعضهم انها اسم من أسماء القرآن ذهب اليه قتادة ومجاهد وابن جريح۔ (8)

بعض نے کہا ہے کہ یہ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ یہی رائے قتادہ، مجاہد اور ابن جریج کی ہے۔ استاد جوادی آملی اس نظریے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ

گرچه اين احتمال نيز محال عقلى نيست، ولى اثبات آن، دليل معتبرى طلبد و دليلى از سوى صاحبان اين رأى ارائه نشده است۔۔۔ مانند اين كه به جاى "كهيعص ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ۔۔۔" بتوانيم بگوييم: "القرآن ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ۔۔۔" ۔۔۔ (9)

اگرچہ یہ احتمال بھی عقلی لحاظ سے محال نہیں ہے مگر اس کے ثابت ہونے کے لیے دلیل معتبر کی ضرورت ہے؛ البتہ اس نظریہ کے حامیوں نے اس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی؛ لہٰذا اس کی حیثیت ایک احتمال سے زیادہ کچھ نہیں؛ اگر یہ حروف قرآن کے نام ہوں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی جگہ لفظ "القرآن" یا قرآن کے دیگر نام لیے جاسکتے ہیں مثلاً فرقان یا ذکر۔ مثلاً "کهیعص ۝ ذکر رحمت ربك۔۔۔" میں ہم یوں کہہ سکیں "القرآن ۝ ذکر رحمت ربك۔۔۔"

۴۔ یہ حروف فکر و عقل کے اول مخلوق ہونے کی طرف اشارہ ہیں

استاد مطہری نے حروف مقطعات پر بات کرتے ہوئے احتمال کے طور پر ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جس کے مطابق فکر و عقل کو خلقت میں مادہ پر تقدم حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

در خاتمه اين بحث احتمال ديگرى را هم طرح كنم و آن اين است كه بحثى از قديم تا به حال مطرح است كه در نظام هستى اول چه بوده است؟ يعنى مقدم و موخر كدام است؟ به طور كلى در جواب اين سوال دو نظر ابراز گرديده، برخى مى گويند اول كلمه و سخن بوده و مقصود

شان این است که اول اندیشه و فهم و درك بوده است۔۔۔ زیرا وقتی می خواهد داستان خلقت را بیان کند، می فرماید: ''اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ'' (10) فرمان او چنین است که وقتی اراده کند چیزی را، همین که بگوید، باش! می باشد۔۔۔ جسم و طبیعت تقدم دارد۔ (11)

حروف مقطعہ کی بحث کے آخر میں میں ایک اور احتمال پیش کرتا ہوں اور وہ یہ کہ قدیم زمانے سے آج تک ایک بحث جاری ہے اور وہ یہ کہ نظام ہستی میں سب سے پہلے کیا تھا یعنی مقدم کیا تھا اور موخر کون؟ کلی طور پر اس سوال کے جواب میں دو نظریات بیان ہوئے ہیں؛ بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے کلمہ اور قول تھا، ان کا مقصد یہ ہے کہ سب سے پہلے عقل و فکر اور فہم و ادراک تھا کیونکہ کلمہ اور قول دراصل فکر کو بیان کرتا ہے اور اس کے بعد مادہ پیدا ہوا دوسرا نظریہ ان لوگوں کا ہے کہ جو مادہ کے تقدم کے قائل ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ پہلے مادہ اور عالم طبیعت وجود میں آیا پھر مادہ کے تدریجاً کامل ہونے سے فہم و شعور اور ادراک پیدا ہوا، پھر کلمہ اور قول کی باری آئی۔

ان دو نظریات میں سے گویا قرآن نے پہلے نظریے کو قبول کیا ہے کیونکہ جب وہ انسان کی خلقت کو بیان کرتا ہے تو فرماتا ہے'' اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے''۔ یعنی پہلے قول ہے اور پھر دیگر مخلوقات۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہ رہ جائے کہ قول سے یہاں مراد صرف لفظ، ہوا اور آواز نہیں بلکہ اس کا جامع تر اور کامل تر معنی ہے، یوں لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حروف مقطعہ کے ذریعے اپنے امر کے آغاز کو بیان فرمایا ہے یعنی قول، سخن اور فکر کو مادہ، جسم اور عالم طبیعت پر تقدم حاصل ہے۔ شاید عجیب نہ ہو کہ ہم استاد مطہری کی مذکورہ بالا بات کی تائید کے لیے سورہ رحمٰن کی ان ابتدائی آیات کو بھی ذکر کریں:

اَلرَّحْمٰنُ O عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ O خَلَقَ الْاِنْسَانَO عَلَّمَهُ الْبَیَانَO

ان آیات میں انسانی تخلیق سے پہلے علم و تعلیم اور قرآن کا ذکر کیا گیا ہے، اگر قرآن کے معنی پر غور و فکر کیا جائے تو وہ ہے ''بہت زیادہ پڑھا جانے والا''۔ گویا علم، قول اور سخن کا ذکر تخلیق انسان سے پہلے اور مقدم ہے، وہی انسان جسے بعد میں بیان سکھایا گیا ہے۔

اول مخلوق کے بارے میں بہت سی احادیث ہیں، کسی میں ''نور'' کو اوّل مخلوق فرمایا گیا اور کسی میں عقل کو، کسی میں قلم کو پہلی خلقت کہا گیا ہے اور کسی میں عزت کو، کسی میں اس پانی کو جس پر عرش الٰہی موجود ہے اور کسی میں فرمایا گیا ہے ''اول ماخلق اللہ نوری'' یعنی اللہ نے سب سے پہلے میرا نور خلق کیا "ان میں سے کوئی بھی چیز مادی نہیں ہے، یہ سب خلقت اول کے مختلف نام اور مختلف پہلو ہیں اور خلقت اول کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ان اسماء سے راہنمائی ملتی ہے۔

علمائے حکمت الٰہی نے اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی ہے، حروف مقطعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں یا نہیں، اس سلسلے میں تو گفتگو ہے اور جاری رہے گی لیکن عالم مادی سے پہلے عالم فکر و عقل اور عالم نور کی خلقت کے نظریے کی تائید مذکورہ احادیث سے ضرور ہوتی ہے۔

چند احادیث ملاحظہ فرمائیں

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''اول ماخلق اللہ نوری'' (12)

یہ بھی فرمایا: ''اول ماخلق اللہ النور'' (13)

ایک اور روایت میں آنحضرتؐ سے یہ بھی منقول ہے: ''اول ماخلق اللہ العقل'' (14)

ابن عباس سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''اول ماخلق اللہ القلم'' (15)

۵۔ حروف مقطعہ پیغمبر اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں

حروف مقطعہ پیغمبر اکرمؐ کو متوجہ کرنے کے لیے ہیں۔ یہ حروف خبر دینے کے لیے ایک گھنٹی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے سورہ زخرف کی تفسیر میں استاد مطہری کہتے ہیں:

اول کہ می گوید(حٰم) این بہ منزلہ زنگ اخبار است بہ قلب پیامبر اکرم، مثل یك نوع حالت هشدار و بیدارباش۔۔۔ او تازہ متوجہ می شود کہ باید خبر بگیرد۔ اول کہ می گوید(حم) این دو حرف، حالت اخبار و اعلام است بہ پیغمبر و هشدار دادن بہ قلب پیمبر و متمرکز کردن او برای گرفتن وحی۔

یہ جو شروع میں کہا گیا ہے ''حم'' یہ رسول اکرمؐ کے دل پر خبر دینے کے لیے ایک گھنٹی کی حیثیت رکھتا ہے، ہم اسے ایک طرح کی آگاہی دینے اور بیدار باش کی علامت سے تشبیہ دیتے ہیں، ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ

ایسے ہے جیسے ٹیلی گراف کی مشین کے اس طرف کوئی بیٹھا ہے جو خود اپنے کام میں مصروف ہے اور ارد گرد کی طرف اس کی توجہ نہیں ہے۔ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ وہ مشین بول پڑتی ہے اور کچھ الف با کی آواز اس سے آتی ہے اور وہ اچانک متوجہ ہوتا ہے کہ کوئی خبر آرہی ہے اور اسے یہ خبر حاصل کرنا ہے، یہ جو شروع میں ''حم'' کہا گیا ہے یہ دو حرف ایک طرح سے رسول اللہؐ کو خبر دینے اور قلب پیغمبرؐ کے لیے اعلان کی حالت ہے اور وحی حاصل کرنے کے لیے آپؐ کو متمرکز کرنے کے لیے یہ حروف ادا کیے جارہے ہیں۔ (16)

۶۔ یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں

یہ حروف تحدی کی حیثیت رکھتے ہیں ،اس معنی میں ان حروف سے مراد حروف ابجد ہی ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کا ذکر کرکے اس حقیقت کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ قرآن انہی حروف سے ترتیب پایا ہے، یہ وہی حروف ہیں جو عربی زبان بولنے والے تمام لوگ استعمال کرتے ہیں ،جس زمانے میں قرآن حکیم نازل ہوا اس زمانے کے عربوں کو اپنے زبان دانوں پر افتخار تھا، قرآن حکیم نے انہی حروف کو استعمال کرکے اس میں گہرے مطالب اور معارف نازل فرمائے، انہی حروف کی ساختہ و پرداختہ کتاب کو معجزے کے طور پر پیش کیا گیا، ان حروف میں گہرے اور عظیم مطالب سمو کر نازل کیے گئے، ایک ایسی کتاب ان حروف سے وجود پذیر ہوئی کہ جس کی آج تک کوئی مثل و نظیر نہیں لاسکے، آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی تفسیر نمونہ میں اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> " باوجودیکہ قرآن انہی حروف الف با اور عام کلمات سے مرکب ہے مگر یہ ایسے موزوں کلمات اور عظیم معانی کا حامل ہے جو انسان کے دل و جان کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، انسان کی روح تحیر اور تحسین کی کیفیات سے دوچار ہو جاتی ہے اور ان کے مطالعے سے افکار و عقول ان کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی جملہ بندی مرتب ہے، اس کے کلمات بلند ترین بنیادوں کے حامل ہیں اور اس میں بلند معانی زیباترین الفاظ کے قالب میں اسی طرح سے ڈھلے ہوئے ہیں جس کی کوئی مثل و نظیر نہیں ملتی۔" (17)

بعض احادیث میں بھی حروف مقطعہ کے وجود سے قرآن حکیم کی عظمت کے حوالے سے استدلال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ معانی الاخبار میں امام حسن عسکریؑ سے روایت کیا گیا ہے، آپ نے فرمایا:

كذبت قريش واليهود بالقرآن، وقالوا هذا سحر مبين تقوله، فقال الله: الم ذلك الكتاب أي يا محمد، هذا الكتاب الذي أنزلته عليك، هوالحروف المقطعة، التي منها: ألف، لام، ميم، و هو بلغتكم و حروف هجائكم، فأتوا بمثله ان كنتم صادقين، واستعينوا على ذلك بسائر شهدائكم۔(18)

قریش اور یہود نے قرآن کی تکذیب کی اور انھوں نے آنحضرت سے کہا کہ جو آپ کہتے ہیں کھلا جادو ہے۔ پس اللہ نے فرمایا الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ یعنی اے محمد یہ جو کتاب میں نے آپ پر نازل کی ہے (اس کے بارے میں ان کو ہماری طرف سے کہیے کہ) یہ حروف مقطعہ (پر مبنی) ہے جن میں سے الف لام میم بھی ہیں، ان کا میں نے تم پر ابلاغ کیا ہے اور یہ تمھارے حروف کے ہجاء ہیں؛ پس اگر تم سچے ہو تو اس کی مثل لا کر دکھاؤ اور اپنے تمام دیگر گواہوں سے بھی مدد لے لو۔

۷۔ صحابہؓ کو ان حروف کا معنی معلوم تھا؟

یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

یہ حروف مقطعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں، جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا، خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے؛ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ہمیں ملتی ہیں، اس استعمال عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستاں نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو؛ بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی ﷺ کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں؟ جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ سے بھی ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انھوں نے نبی ﷺ سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لیے ان کے معانی متعین کرنا مشکل تر ہو گیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے اور نہ یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنی نہ جانے گا تو اس کے راہ راست پانے میں کوئی

نقص رہ جائے گا؛ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔(19)

اس نظریے پر تنقید کرتے ہوئے مولانا سلیم اللہ خان لکھتے ہیں:

"خلفائے راشدین و جمہور صحابہ کرامؓ تو پوری زندگی یہی کہتے رہے کہ حروف مقطعات متشابہات کے قبیل سے ہیں، ان کے معنی اور مراد کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے؛ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں: "یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے، جن کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو۔"

جن صحابہ کرامؓ سے بعض معانی منقول ہیں انھوں نے یہ معانی ایک فائدے اور نکتے کی حیثیت سے بیان کیے ہیں کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے یہ دعویٰ منقول نہیں ہے کہ زبان نبوت سے جب فلاں حروف مقطعات جاری ہوئے تو ہم نے اس کے یہ معنی سمجھے تھے لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں"سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے؟"

اگر مودودی صاحب کا موقف درست تسلیم کر لیا جائے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانت و دیانت پر حرف آئے گا کہ حروف مقطعات کے معانی و مراد کا علم ہونے کے باوجود امت کو اس خزانے سے محروم رکھ کر انہوں نے خیانت کا ارتکاب کیا ہے۔ (معاذ اللہ) اور ان کی دیانت بھی اس وجہ سے قابل اطمینان نہ رہے گی کہ انھوں نے اسلوب بیان کے متروک ہونے کے بعد علوم نبوت کی حفاظت سے غفلت برتی اور اپنے ذہن و فکر کے تمام گوشوں سے وہ معانی ہی مٹا دیے جو آنحضرتؐ کی تلاوت کے وقت سمجھے تھے، جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امانت و دیانت کی ضمانت ہی مشکوک ٹھہری تو علوم شریعت کے محفوظ اور صحیح ہونے کی ضمانت کس طرح دی جاتی ہے؟

لسانیات سے متعلق ادنیٰ سی سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی مودودی صاحب کے موقف کو تسلیم کرنے میں تامل کرے گا، مودودی صاحب کے مضمون کے پیش نظر دیکھا جائے تو ایک طرف اس اسلوب کا چلن اس قدر عام تھا کہ بولنے والے کو اس کے معنی بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی دوسری طرف یہ اس قدر جلدی متروک ہو گیا کہ اپنی فہم سے سمجھنے والے بھی اپنی زندگی کے کسی حصے میں بیان کرنے سے قاصر رہے۔ کس زبان کا اسلوب اس قدر تیزی سے بدل جاتا ہے اور کیا اسلوب بدلنے سے معنی بھی کلیۃً معدوم ہو جاتے ہیں؟(20)

ہماری رائے میں مودودی صاحب کا نقطۂ نظر تاریخ و تفسیر اور حدیث کے ذریعے پہنچنے والی معلومات سے میل نہیں کھاتا لیکن اس سلسلے میں مولانا سلیم اللہ خان نے جس انداز سے تبصرہ کیا ہے وہ مناسب معلوم نہیں ہوتا اس مسئلے میں مودودی صاحب کے نقطۂ نظر کو ان کے عدم التفات پر محمول کرنا چاہیے تھا۔
تاہم اگر تفسیر اور حدیث نیز تاریخ کے قدیم لٹریچر کی بنیاد پر مودودی صاحب کی رائے نا قابل قبول ہے تو پھر مولانا حمید الدین فراہی اور ان کے پیروکاروں کے نقطۂ نظر کے بارے میں بھی بحیثیت مجموعی یہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔ ان کے نقطۂ نظر کا ذکر آئندہ سطور میں آئے گا۔ (ان شاء اللہ)

حوالہ جات

1 ۔علامہ آلوسی کی اصل عبارت ہم یہاں درج کرتے ہیں:
ومن الظرف أن بعض الشبعة استأنس بهذه الحروف لخلافة الأمیرعلی کرم الله تعالی وجهه فانه اذا حذف منها المکرر یبقی مایمکن أن یخرج منه ''صراط علی حق نمسکه'' ۔۔۔آلوسی، سید محمود، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم، تصحیح: علی عباد البری العطیه(بیروت، دار لکتب العلمیه، ۱۹۹۴ء)ج۱، ص۱۰۶و۱۰۷

2 ۔جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم(قم، مرکز نشر اسرائ، ۱۳۷۸ش، ط اول)ج۲، ص ۶۷و۶۸

3۔ آل عمران: ۷

4۔ طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن(بیروت، دار المعرفة، ۱۹۸۶ئ)ج۱، ص۱۱۲

5۔ طبرسی، فضل بن حسن: مجمع البیان فی تفسیر القرآن(بیروت، دار المعرفة، ۱۹۸۶ئ)ج۱، ص۱۱۲

6۔ سر سید احمد خان، تفسیر القرآن مع تحریر فی اصول التفسیر، (لاہور، دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۹۴) حصہ، اول، ص ۱۴تا۱۶

7 ۔ طوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن: التبیان فی تفسیر القرآن(بیروت، مکتب الاعلام الاسلامی، ط اول، ۱۴۰۹ھ ق)ج۱، ص ۴۸و۴۹

8 ۔ طوسی، ابی جعفر محمد بن الحسن: التبیان فی تفسیر القرآن(بیروت، مکتب الاعلام الاسلامی، ط اول، ۱۴۰۹ھ ق)ج۱، ص۴۷

9۔ جوادی آملی، تسنیم، تفسیر قرآن کریم (قم، مرکز نشر اسرائ، ۱۳۷۸ھ ش، ط اول) ج۲، ص ۷۳

10 ۔یٰسٓ: ۸۲

11 ۔ مطہری، مرتضٰی، آشنای باقرآن، انتشارات صدرا، تہران ۱۳۷۰ش، ج۱و۲، ص ۱۶۴

12 ۔ بحارالانوار جلد۹، ص۳۲۱، روایت ۱۴، باب ۲

13 ۔ بحارالانوار جلد۹، ص۳۲۱، روایت ۱۴، باب ۲

14 ۔ الکافی، ج۱، ص۱۱۰، ح ۴

15 ۔ التوحید الصدوق، ص ۱۶۴

16 ۔ مطہری، مرتضٰی، آشنای باقرآن، انتشارات صدرا، تہران ۱۳۷۰ش، ج ۶، ص ۱۶۰

17 ۔ ناصر مکارم شیرازی، ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفی، تفسیر نمونہ، مصباح القرآن ٹرسٹ، ۲۰۱۱ئ، ج۱، ص۷۹

18۔ شیخ صدوق: معانی الاخبار (لبنان، بیروت دار المعرفہ، ۱۳۹۹ھ) حدیث ۴، ص ۲۴

19۔ امودودی، ابوالاعلٰی، تفہیم القرآن (لاہور، ادارہ ترجمان القرآن) ج۱، ص۴۹

20۔ http://www.farooqia.com/ur/lib/1433/05/p5.php

عقیدہ رجعت قرآن وحدیث کی روشنی میں

سید عقیل حیدرزیدی

dr.sahawasti@yahoo.com

کلیدی کلمات: رجعت، کرّۃ (بازگشت)، دابۃُاللہ، ایامُ اللہ، مومنینِ خالص، ظہورِ حضرتِ مہدیؑ، تناسُخ۔

خلاصہ

رجعت مذہب شیعہ کے اعتقادات میں سے ایک ہے، جو عرصہ دراز سے موردِ بحث و مباحثہ رہا ہے، اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دینی تعلیمات اور عقل وخرد کی اساس پر اس عقیدے کے امکان اور واقع ہونے پر استدلال کیا جائے اور رجعت کے معنیٰ کی جانچ پڑتال کرنے، تاریخی پس منظر، ذہن میں اُبھرنے والے سوالات اور تاریخی قرائن و شواہد سے استفادہ کرتے ہوئے، عقیدۂ رجعت کے ممکن ہونے کو ثابت کیا جائے اور پھر قرآنِ کریم کی متعدّد آیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، ان تفسیری روایات کو ملاحظہ کریں، جو رجعت کے واقع ہونے کی خبر دیتی ہیں اور نیز وہ روایات جو بطورِ مستقل اس عقیدے کو بیان کرتی ہیں، اس مقالے کو مرتّب و منظّم کرنے میں محورِ اصلی ہیں۔

آخر میں اس عقیدے پر وارد ہونے والے شبہات اور اشکالات، کہ یہ عقیدہ تعلیماتِ قرآن یا سنّتِ الٰہی کے برخلاف ہے یا عقیدۂ رجعت کو "ابنِ سباء" کے من گھڑت افسانوں میں سے قرار دیا جاتا ہے، کا جواب دیا گیا ہے۔

مقدّمہ

جرأت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تاریخ اور فرہنگ و تمدنِ بشری میں دین اور اعتقادات دینی کی مانند کوئی اور چیز حسّاس، موثّر اور نقش آفرین نہیں رہی ہے، کیونکہ یہ دوسرے انسانی فکری اور فرہنگی تفکّرات پر بھی اثر گزار رہے ہیں، یا حدِّ اقل تحقیق و توجہ خاص کے عنوان سے موضوع بحث رہے ہیں۔
دینی اعتقادات میں سے ایک چیز جس کے بارے میں عرصہ دراز سے بحث کی جاتی رہی ہے اور ہمیشہ ایک جانب سے موردِ اعتراض اور قابلِ تردید اور دوسری طرف سے اس کا دفاع اور جواب دیا جاتا رہا ہے، وہ مسئلہ ''عقیدۂ رجعت'' ہے۔ درحالانکہ قرآنِ کریم کی متعدّد آیاتِ شریفہ، مختلف موارد میں رجعت کے بارے میں اشارہ کرتی ہیں اور معصوم علیہم السلام راہنماؤں سے ہم تک پہنچنے والی روایات بھی عصرِ حضرتِ مہدی علیہ السلام میں بعض انسانوں کی بازگشت کے بارے میں بات کرتی ہیں، لیکن بعض مسلمان لکھنے والوں نے گزشتہ اور موجودہ زمانے میں اپنی تحریروں میں اصلِ رجعت کو موردِ اعتراض قرار دیتے ہوئے، اس کے بارے میں شبہات اور سوالات پیدا کئے ہیں اور ''رجعت'' کے عقیدے کو غیر اسلامی مکاتب و مذاہب کے تراوشات (پھوٹنے والے عقیدے) سے خیال کیا ہے اور اس عقیدے کو بےبنیاد ظاہر کرنے اور عقیدے کی بارے میں دوسروں کے اذہان کو مخدوش کرنے کے لیے، رجعت کی کیفیت کو، کہ جس کا شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں، تحریف کر دیا ہے۔
ابنِ منظور، جو ساتویں صدی ہجری کا اہل سنّت کا مشہور دانشور اور زبان شناس ہے، ابنِ اثیر (جو چھٹی صدی ہجری کے دانشوروں میں سے ہے) کی پیروی کرتے ہوئے، ''رجعت'' کے لغوی معنیٰ کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے، اس طرح لکھتا ہے:

الرَّجْعَةُ مذهب قوم من العرب في الجاهلية معروف عندهم ـ ـ ـ أُخرج مع فلان" (1)

یعنی ''رجعت زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی ایک قوم کا مذہب تھا، جو عربوں کے نزدیک معروف و مشہور تھی اور مسلمانوں کے فرقوں میں سے ایک طائفہ کا مذہب ہے، جو اہلِ بدعت اور اہلِ ہوس ہیں، وہ یہ (عقیدہ رکھتے ہوئے) کہتے ہیں کہ مرنے والا دنیا میں لوٹ آئے گا اور دنیا میں زندگی گزارے گا جیسے پہلے رہا کرتا تھا اور ان میں سے من جملہ رافضیوں کا ایک گروہ ہے جو اس بات کا قائل ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام بادلوں میں مستقر ہیں، وہ اپنی اولاد کے ساتھ

بادلوں سے خارج نہ ہوں گے یہاں تک کہ منادی آسمان سے نداء دے گا کہ فلاں کے ساتھ (بادلوں سے) نکل آؤ۔"

ابنِ اثیر اپنے اس بیان میں: "رجعت" کو عربِ جاہلی اور نیز رافضیوں کا عقیدہ معرّفی کرتا ہے، جو معتقد ہیں کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام بادلوں کے درمیان چھپے ہوئے ہیں اور اس وقت تک کہ منادی یہ صدا بلند کرے کہ "فلاں کے ساتھ باہر آجاؤ!" تو وہ اپنے بعض فرزندوں کے ساتھ (بادلوں کے پیچھے سے) باہر نہیں آئیں گے۔ اسی وجہ سے علماء اور شیعہ دانشوروں نے اسلام کی ابتدائی صدیوں سے قلم اٹھایا ہے اور منطقی، مُستند اور مُستدلّ طریقوں سے شیعہ عقائد کا دفاع کیا ہے، ان ہی میں سے "رجعت" کا عقیدہ بھی ہے۔ علّامہ مجلسیؒ لکھتے ہیں:

"چالیس سے زائد علماء اور بزرگوں نے کہ جن میں سے بعض صحابہ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے قریبی افراد تھے، "رجعت" کے بارے اور اس کے اثبات میں مستقل کتابیں تحریر کی ہیں یا یہ کہ اپنی اعتقادی کتابوں کے ایک حصّے کو اس عقیدے کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔" (2)

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ آیاتِ قرآن، روایاتِ معصومین علیہم السلام اور نیز شواہد اور قرائنِ عقلی سے استفادہ کرتے ہوئے، "عقیدۂ رجعت" کے بارے میں تحقیق کی جائے اور صحیح و درست نظریے کا انتخاب کیا جائے۔

پہلی فصل: کلیات

پہلا مطلب: رجعت کا معنیٰ

الف) لغت میں رجعت کا معنیٰ[1]

قرآنِ کریم، روائی منابع اور اصولِ عقائد کی کتابوں میں، رجعت، کرّہ، ردّ اور حشر کے الفاظ، سب بازگشت اور پلٹنے کے معنیٰ[1] میں استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان تمام الفاظ میں سے لفظِ رجعت سب سے زیادہ مشہور ہے۔

الرَّجعةُ: مُراجعةُ الرَّجل أهله بعد الطلاق وقومٌ يؤمنون بالرجعة الى الدنيا قبل يوم القيامة(3)

یعنی ''رجعت، مرد کا طلاق کے بعد اپنی زوجہ کی طرف پلٹنا ہے اور بعض معتقد ہیں کہ رجعت (مرنے کے بعد) روزِ قیامت سے پہلے دنیا کی طرف لوٹنا ہے۔''

تقول: رجع یرجع رجوعاً: اذا عاد، و راجع الرجل (مَرأته وهی الرَّجعة والرَّجعة) (4) یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب مرد اپنی زوجہ کی طرف لوٹ آتا ہے۔ابنِ منظور ''رجعت'' کو مادۂ رجوع سے ''مصدرِ مرّہ'' کے طور پر ''ایک بار پلٹنے'' کے معنیٰ میں سمجھتا ہے۔(5)

"طریحی": "والرَّجعةُ بالفتح هی المَرّة فی الرجوع بعد الموت بعد ظهور المهدی علیه السلام وهی من ضروریات مذهب الامامیة وعلیها من شواهد القرآنیة وأحادیث اهل البیت علیهم السلام، هو أشهر من أن یُذکر حتی أنه و ردعنهم من لم یُؤمن برجعتنا ولم یقر بمتعتنا فلیس منا" (6)

یعنی "رجعت "راء کے فتحہ کے ساتھ، موت کے بعد حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت ایک بار (دوبارہ) پلٹنے کے معنیٰ میں ہے اور یہ (عقیدہ) مذہبِ امامیہ کی جملہ ضروریاتِ مذہب سے ہے اور آیاتِ قرآن اور احادیثِ اہل بیت علیہم السلام سے اس پر متعدّد شواہد دلالت کرتے ہیں، یہاں تک کہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص رجعت و بازگشت اور متعہ کے اقرار (نکاح موقّت جو آئمہؑ اور شریعت اسلام کی رُو سے جائز قرار دیا گیا ہے) پر عقیدہ و ایمان نہیں رکھتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

"شرتونی": رَجَع الرَّجل رجوعاً انصرف۔۔۔ وهویُؤمن بالرجعة ای بالرجوع الی الدنیا بعد الموت۔(7)

یعنی "رجع یعنی مرد کا لوٹ کر آنا ہے۔۔۔اور رجعت یعنی بازگشت پر ایمان رکھنا، یعنی موت کے بعد دنیا کی طرف (دوبارہ) بازگشت۔"

ب) اصطلاح میں رجعت کا معنیٰ

لفظِ ''رجعت'' بھی دوسرے بہت سے الفاظ کی طرح لغوی معنیٰ کے علاوہ، مختلف علوم میں گوناگوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔

پہلا معنیٰ : فقہی اصطلاح میں : مرد کا اپنی مطلّقہ زوجہ کی طرف (عدّت کی) قانونی و شرعی مدّت میں لوٹ آنا۔(8)

دوسرا معنیٰ : علم نجوم کی اصطلاح میں : ستارے کی اپنی حرکت کے علاوہ، بروج میں مخالف سمت میں حرکت (اور مدار سے خارج ہونے) کو "رجعت" یا "عکس" بھی کہتے ہیں۔(9)

تیسرا معنیٰ : علم عرفان کی اصطلاح میں : کسی صاحب عمل شخص سے کوئی بُرا اور قبیح فعل صادر ہونے یا کوئی پست اور گھٹیا بات بولنے کے بعد ندامت، پشیمانی اور ملال کا عود کرنا۔(10)

چوتھا معنیٰ: جامعہ شناسی کی اصطلاح میں : بعض جامعہ شناس، جامعہ اور تاریخ کے قانون مند ہونے کی بحث کے وقت اس بات کے معتقد ہیں کہ قوانین اور تصوراتِ تاریخی تمام جوامع میں مشترک ہیں اور تاریخ تین مرحلے، ربّانی، قہرمانی (بڑی تاریخی شخصیت) اور انسانی کو طے کرتی ہے اور ہمیشہ یہ تین دور تکرار ہوتے رہتے ہیں اور جامعہ شناس اس حرکتِ تاریخ کو "ادوار" "اکوار" اور "رجعت" کہتے ہیں۔(11)

پانچواں معنیٰ : علمِ کلام کی اصطلاح میں :

"اِعْلَم اَن الرَّجعة هنا هی الحَیٰواةُ بعد الموت قبل القیامة وهو الذی یتبادر من معناها صرّح به العلماءُ هنا کما یأتی ویفهم من مواقع استعمالها ووقوع التصریح به فی أحادیثها کما تطلع علیه فیما بعد۔" (12)

یعنی "رجعت یہاں موت کے بعد قیامت سے پہلے (دوبارہ) زندہ ہونا ہے اور لفظِ رجعت سے متبادر بھی یہی معنی ' ہوتا ہے اور جیسا کہ بعد میں آئے گا کہ علماء نے بھی اسی معنیٰ کی تصریح فرمائی ہے اور اس کے استعمال کے موارد بھی اسی پر گواہ ہیں، احادیث میں بھی اسی کی تصریح کی گئی ہے، جس طرح کے بعد میں آپ اس سے آگاہ ہوں گے۔"

اس لحاظ سے کہ ''رجعت'' شیعہ اعتقادات کی روشنی میں موت کے بعد بطورِ اطلاق زندہ ہونا نہیں ہے؛ کیونکہ جو اشخاص گزشتہ زمانے میں زندہ ہوئے ہیں، اُن پر ''رجعت'' کا اطلاق نہیں ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مرحوم شیخ حر عاملیؒ کی تعریف تمام پہلوؤں سے اس اصطلاح ''رجعت'' کو بیان کرنے والی نہیں

ہے۔ایک اور تعریف شیخ مفیدؒ نے بیان کی ہے، جو کامل تعریف اور اصطلاح رجعت کو تمام جوانب سے نمایاں کرنے والی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَردُ قوماً مِنَ الأمواتِ اِلی الدُنیا فِی صُوَرِھِم الّتی کانُوا عَلَیھا فیَعزّ فَرِیقاً وَیَذلُّ فَرِیقاً المُحَقّین مِن المُبْطِلین وَالمَظْلُومین مِنھم مِنَ الظّالِمین وَذٰلِکَ عِنْدَ قِیامِ المَھْدِی آلِ مُحَمّدعلیھم السلام (13)

یعنی "اللہ تعالیٰ اموات کے کچھ گروہ ان کی گزشتہ صورتوں میں دنیا میں پلٹائے گا، ان میں سے کچھ کو عزیز (و صاحبِ عزّت) اور کچھ کو ذلیل و خوار کرے گا، اہل حق کو اہل باطل پر نصرت و کامرانی عطا کرے گا اور مظلوموں کو ظالمین پر غلبہ دے گا اور یہ سب کچھ حضرت مہدی آل محمد علیہم السلام کے ظہور کے وقت رونما ہوگا۔"

شیخ مفیدؒ نے اس تعریف میں رجعت کے بارے میں پانچ اہم نکات کی طرف اشارہ کیا ہے:

پہلا: رجعت بازگشت اور لوٹنا ہے، نہ صرف زندہ ہونا، اس لیے گزشتہ اُمّتوں کے درمیان زندہ ہونے والے مُردوں کے لیے رجعت نہیں کہا جاتا۔

دوسرا: یہ بازگشت اموات کے کچھ گروہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

تیسرا: یہ بازگشت اسی دُنیوی صورت اور خواصّ کے ساتھ ہوگی۔

چوتھا: اس بازگشت کا فلسفہ و ہدف ایک گروہ کو عزّت دینا اور دوسرے گروہ کو ذلّت و رسوائی سے روبرو کرنا اور حق و باطل کے درمیان جدائی ڈالنا اور ظالم سے مظلوم کا حق لینا ہے۔

پانچواں: اس بازگشت کا زمانہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کا وقت ہے۔

بنابر ایں، رجعت اصطلاح میں مُردوں کے چند گروہوں کا اس جہاں میں حضرت مہدی علیہ السلام کے عالمی قیام کے ہم زمان بازگشت کرنا ہے اور طبیعتاً اس گروہ کا بازگشت کرنا، روز قیامت سے پہلے ہوگا۔ اس لیے رجعت کبھی تو قیامت سے قبل کی رویداد میں شمار کی جاتی ہے اور کبھی حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور سے مربوط حوادث کے زُمرے میں اِسے ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ مسئلہٴ رجعت، شیعہ نقطہٴ نظر سے (قیامت و ظہور حضرت مہدیؑ کے) دونوں مذکورہ موضوعات سے ایک مستقل رویداد شمار ہوتا ہے، اگرچہ ان تینوں موضوعات میں زمانی تعلّق اور ارتباط موجود ہے۔

دوسرا مطلب: تاریخی پس منظر

تاریخی لحاظ سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ موجود روایات کے مطابق، رجعت اُن اعتقادی مفاہیم میں سے ایک ہے جو خود حضرت رسول خدا ﷺ کے زمانے میں لوگوں کی زبان پر تھے اور آنحضرتؐ نے ایک حدیث میں اسے ''خروج'' کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔

علّامہ مجلسیؒ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت رسول خدا ﷺ امیر المومنین علی علیہ السلام کے پاس آئے، جبکہ وہ مسجد میں سوئے ہوئے تھے اور انہوں نے ریت کو اکٹھا کرکے سرہانے کے طور پر سر کے نیچے جمع کیا ہوا تھا، پیغمبر ﷺ نے پاؤں سے اُنہیں ہلایا اور فرمایا: "اے دابۃُ اللہ (زمین پر چلنے والی خدا کی مخلوق) اُٹھ جاؤ!" اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: اے رسولِ خدا ﷺ کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم بھی اس نام کو دوسروں کے لیے استعمال کریں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: "ہر گز نہیں! خدا کی قسم! کہ یہ مخصوص اس (علی علیہ السلام) کا نام ہے اور وہ وہی "دابۃ" (چلنے والی مخلوق) ہیں، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے:

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ۔" (14)

ترجمہ: "اور جب ان پر وعدہ (عذاب) پورا ہونے والا ہوگا تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک چلنے پھرنے والا نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا کہ درحقیقت لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں کرتے تھے۔"

پھر آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

"اے علیؑ! جب آخر الزمان آجائے گا تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین شکل میں زمین سے نکالے گا، جبکہ تمہارے ساتھ ایک عصا ہوگا جس کے ذریعے تم اپنے دشمنوں کو مشخّص و معیّن کروگے۔" (15)

اس روایت کو ملاحظہ کرتے ہوئے کہ یہ سند کے لحاظ سے بھی صحیح اور مستند ہے اور علّامہ نے اس کو تفسیر قمی سے نقل کیا ہے، اطمینان کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ پیغمبر گرامی ﷺ نے حضرت علی علیہ

السلام کی آخر زمانے میں بازگشت کو زمین سے خارج ہونے سے تعبیر کیا ہے اور یہ وہی مفہومِ "رجعت" کو بیان کرتا ہے۔

تیسرا مطلب: تحقیقی سوالات اور فرضیے

ہر تحقیق میں، محقّق اُن سوالوں کا، جو اُس کا ذہن مشغول کئے ہوئے ہوتے ہیں، جواب تلاش کرنے کے ساتھ اپنی تحقیق کا آغاز کرتا ہے، اس تحقیق میں بھی کچھ سوالات در پیش تھے، جن کا صاحبِ مقالہ نے جواب دینے کی کوشش کی ہے:

الف: کیا (عقیدۂ) رجعت کا عقل کی نظر سے وقوع ممکن ہے؟

ب: کیا رجعت (کا عقیدہ) قرآنی تعلیمات کی روشنی میں قابلِ قبول ہے؟

ج: کیا رجعت کی اساس وبنیاد دینی تعلیمات میں وجود رکھتی ہے یا یہ عقیدہ جامعہ اسلامی میں نفوذ کرنے والے بعض افراد کی جعلیات اور من گھڑت چیزوں میں سے ہے؟

د: اس بات کے پیشِ نظر کہ بعض مُردوں کے لوٹنے اور زندہ ہونے کا امکان، قرآنِ کریم میں شدّت کے ساتھ نفی کیا گیا ہے، تو رجعت کو کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے؟

ھ: کیا رجعت کا عقیدہ، معاد اور قیامت کے ہدف کے ساتھ منافات نہیں رکھتا؟

و: کیا رجعت، الٰہی سنّتوں کے ساتھ ناسازگار نہیں ہے؟

چوتھا مطلب: شیعہ عقیدے میں رجعت کا مقام و منزلت

اسلامی روایات میں رجعت کا عقیدہ ایک خاص مقام و منزلت کا حامل ہے، یہاں تک کہ بعض روایات میں، رجعت کا دن، الٰہی دنوں میں سے ایک، کہ جس دن اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت (زیادہ) متجلّی و نمایاں ہوگی، قرار دیا گیا ہے:

عن ابی عبداللہ علیہ السلام عن ابیہ قال: ایّامُ اللہ ثلاثۃٌ: یومُ یقومُ القائم ویومُ الکرّۃ ویومُ القیامۃ۔(16)

یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام اپنے والدِ گرامی امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل فرماتے ہیں کہ آپؑ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے دن، تین ہیں: وہ دن جب قائم آل محمد علیہ السلام قیام فرمائیں گے، رجعت کا دن اور قیامت کا دن۔"

البتہ یہ کہ خاص دنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دی جاتی ہے، جبکہ تمام دن اللہ تعالیٰ ہی سے مربوط ہیں، یہ اس وجہ سے ہے کہ اِن دنوں میں امرِ الٰہی اور اس کی قدرت اس قدر ظہور کرتی اور نمایاں ہوتی ہے کہ دوسرے دنوں میں اس طرح ظاہر اور نمایاں نہیں ہوتی ہے۔

علّامہ طباطبائیؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد، وضاحت کرتے ہیں کہ اس روایت سے مقصود "ایّامُ اللہ" کے بعض روشن اور واضح مصادیق کو معیّن کرنا ہے، نہ یہ کہ "ایّامُ اللہ" انہی تین دنوں میں منحصر ہوں، اس لیے مرنے کے دن اور الٰہی نعمتوں و رحمتوں کے ظاہر ہونے کے دن کو بھی جملہ "ایّامُ اللہ" میں شمار کرتے ہیں۔(17)

ایک دوسری روایت میں رجعت کا عقیدہ، شیعوں کی ایک خصوصیت کے طور پر بیان ہوا ہے:

قالَ الصّادقُ علیہ السلام: لَیسَ منّا مَن لَم یُؤمن بِکَرَّتِنا ولَم یَستحل مُتعَتنا۔ (18)

یعنی امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: "جو شخص بازگشت پر ایمان نہ رکھتا ہو اور متعہ (نکاح موقّت) کو حلال نہ سمجھے، وہ ہم (شیعوں) میں سے نہیں ہے۔"

عن الصادق علیہ السلام قالَ: مَن أقرّ بسبعة أشیاءَ فھو مُؤمنٌ (وذکر منھا) الأیمان بالرّجعة۔ (19)

یعنی امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ''جو کوئی سات چیزوں کا اقرار کرتا ہو وہ مومن ہے اور ان میں سے ایک رجعت (بازگشت) پر ایمان ہے۔''

مرحوم شُبّرؒ نیز تحریر کرتے ہیں:

"اصلِ رجعت حق ہے اور اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے اور اس پر اعتقاد و ایمان نہ رکھنا، مومنین اور شیعوں کے زُمرے سے خارج ہونے کا موجب ہے۔"

مزید بیان کرتے ہیں کہ:

"رجعت پر ایمان کلی طور پر واجب اور ضروری ہے۔"(20)

ضروری ہے کہ یہاں پر مرحوم شُبّر کے مخالف نظریہ کو بھی ذکر کیا جائے جو رجعت کو ایک مسلّمہ تاریخی مسئلہ سمجھتے ہیں کہ جس کا عقیدہ رکھنا یا انکار کرنا، ذرّہ برابر بھی ایمان کو خدشہ دار نہیں کرتا ہے۔(21)

پانچواں مطلب: رجعت کی مختلف تفاسیر

اگرچہ امامیہ کی قریب باتفاق اکثریت رجعت سے وہی معنیٰ و مطلب اَخذ کرتی ہے جو اس کی اصطلاحی تعریف کے ضمن میں بیان ہوا ہے، لیکن بعض ایسے افراد بھی موجود ہیں جو "رجعت" کی دوسری تفسیریں پیش کرتے ہیں:

۱۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ رجعت سے مقصود حکومتِ اسلامی کا حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے ساتھ اہل بیت علیہم السلام کی طرف لوٹنا ہے اور وہ اُن تمام روایات کو جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں، اسی معنیٰ میں تاویل کرتے ہیں اور سر کردہ اشخاص کی بازگشت اور مُردوں کے زندہ ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ (22)

علّامہ مظفرؒ بھی رجعت کی اس تفسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"والامامية بأجمعها عليه (یعنی رجعت کا معنیٰ دنیا کی طرف بازگشت) الّا قليلونَ منهم تأولوا ما وَرَدَ في الرجعة بأن معناها رجوعُ الدولة والأمر والنهي الى آل البيت عليهم السلام بظهور الامام المنتظر عليه السلام من دون رجوع أعيان الاشخاص وإحياء الموتىٰ۔" (23)

یعنی "امامیہ کی اکثریت، رجعت سے خود سر کردہ اشخاص کے بازگشت کرنے اور مُردوں کے زندہ ہونے کے معنیٰ کی ہی قائل ہے، سوائے امامیہ کے کچھ افراد کے جو رجعت کو ظہور امامِ مہدی علیہ السلام کے وقت حکومتِ اہل بیت علیہم السلام کی بازگشت، سے تأویل کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ خود سر کردہ اشخاص کے لوٹنے اور بازگشت کرنے اور مُردوں کے زندہ ہونے کے قائل ہوں۔"

۲۔ بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود حضرتِ مہدی علیہ السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح، دنیا سے لے جانے کے بعد، دوبارہ دنیا میں پلٹائے گا، تاکہ ایک اور مدّت تک زمین میں رہیں۔ اُن کی دلیل و مستند ایک ایسی روایت ہے جو شیخ طوسیؒ کی کتاب "الغيبة" میں ذکر ہوئی ہے:

"اِنَّ الامامَ يَمُوتُ ثُمّ يَعِيْشُ أو يُقتَل ثُمّ يَعيش" (24)

یعنی "ہر امام مر جائے گا اور پھر زندہ ہوگا یا قتل کر دیا جائے گا اور پھر دوبارہ زندہ ہوگا۔"

دوسری روایت فضل بن شاذان نیشاپوری امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتا ہے کہ:

"امام مہدی علیہ السلام کے "قائم" کہے جانے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ دنیا سے چلے جانے کے بعد، دوبارہ زندہ ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے قیام فرمائیں گے۔" (25)

۳۔ امامیہ کی قریب باتفاق اکثریت اس بات کی قائل ہے کہ اللہ تعالیٰ اموات اور مُردوں کے چند گروہوں کو، جو ایمان کے عالی ترین درجات یا فساد کے پست ترین درجات رکھتے تھے، حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت، ان کو اُن کی ہی صورتوں میں دنیا میں پلٹائے گا، تاکہ ایک گروہ کو عزّت اور دوسرے گروہ کو ذلّت و رسوائی سے روبرو کرے، حق کو باطل سے جدا اور مظلوم کے حق کو ظالم سے دلوائے۔

چھٹا مطلب: رجعت کا فلسفہ

آیاتِ قرآنی اور روایاتِ معصومین علیہم السلام سے رجعت کے چند اہداف و فلسفے استفادہ ہوتے ہیں:

۱۔ رجعت عمومی جنبہ نہیں رکھتی، بلکہ مومنینِ خالص اور کافرینِ خالص کے ساتھ مخصوص ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اِنَّ الرَّجعةَ لَیستْ بعامَّةٍ وھیَ خاصَّةٌ لَایَرجِعُ اِلّا من مَحض الاِیمان محضاً أو محض الشرك محضاً۔" (26)

اسی بنا پر مومنینِ خالص کا وہ گروہ جو اپنی زندگی کے تکامل و پیشرفتِ معنوی کے راستے میں موانع اور رکاوٹوں کا شکار ہو گئے اور ان کا تکامل ناتمام رہ گیا، حکمتِ الٰہی یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اس جہاں میں دوبارہ لوٹنے کے ساتھ اپنے تکاملی سفر کو آگے بڑھائیں اور حق و عدالت کی عالمی حکومت کے شاہد اور ناظر بن جائیں، نیز اسی طرح ہٹ دھرم منافقین اور ظالمین کا گروہ، قیامت کے دن اپنے مخصوص انجام سے پہلے، دوسری سرکش اقوام جیسے: فرعونوں، عاد، ثمود اور لوط کی قوموں کی طرح، جنہوں نے اسی جہاں میں سخت عذاب کا سامنا کیا، یہ بھی شدید دنیوی عذاب میں مبتلا ہوں اور اس کا واحد راستہ "رجعت" کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

۲۔ متونِ دینی (آیات و روایات) سے یہ استفادہ ہوتا کہ قیامت سے پہلے، دینِ اسلام تمام اَدیان اور مکاتبِ بشری پر کامل غلبہ اور تسلُّط حاصل کرلے گا اور انسانی مواعظ سے تھکے ماندہ لوگ، معرفتِ الٰہی کے خالص اور خوشگوار چشمے سے سیراب ہوں گے۔ کرۂ زمین کی اجتماعی اور سیاسی قیادت اور حاکمیت

حضرت مہدی علیہ السلام کی رہبری میں مسلمانوں کے ہاتھ میں چلی جائے گی، اسی بنیاد پر رجعت کے فلسفوں میں سے ایک، دینِ اسلام کی نصرت ومدد اور پورے روئے زمین پر وسیع دینی حکومت کی تشکیل میں مدد فراہم کرنا ہوگا چنانچہ امام باقر علیہ السلام اس آیت شریفہ:

"هُوَ الَّذِی أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔"(27)

ترجمہ: "اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اسی نے بھیجا تاکہ اسے ہر دین پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو برا ہی لگے۔"

اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"يُظهِرُهُ اللهُ عَزّوجَلّ فی الرَّجعةِ۔" (28)

یعنی "خداوند رجعت کی صورت میں دینِ حق کو دوسرے اَدیان پر غلبہ وبرتری عطا کرے گا۔"

ایک دوسری روایت میں آپؑ فرماتے ہیں:

"اِنَّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اذا رَجَعَ آمَنَ به النّاسُ كُلُّهم۔" (29)

یعنی "جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رجعت (بازگشت) فرمائیں گے، تو سب لوگ آپؐ پر ایمان لے آئیں گے۔"

سید مرتضیٰؒ رجعت کا ہدف وفلسفہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اِن الّذی تَذهَب الشیعةُ الامامیةُ الیه أنّ اللهَ تعالیٰ۔۔۔بما یُشاهِدنَ من ظُهورِ الحَق وعُلُوّ كلِمَةِ أَهلِه۔"(30)

یعنی "شیعہ امامیہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ امام زمانہ حضرتِ مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت شیعوں میں سے اُن لوگوں کے گروہ کو جو اس سے پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے، اُن کو دوبارہ پلٹائے گا، تاکہ وہ حضرتِ مہدی علیہ السلام کی نصرت کے ثواب، ان کی معرفت اور اُن کی عالمی حکومت کے مشاہدے کے درجہ پر فائز ہوں اور اسی طرح اُن حضرتؑ کے ہٹ دھرم اور ضدّی دشمنوں کے گروہ کو بھی پلٹائے گا، تاکہ وہ اُن سے انتقام لیں۔ پس شیعہ حق کے ظاہر ہونے اور اہلِ حق کے کلمے کے بلند ہونے کا مشاہدہ کرکے لذّت وسرور محسوس کریں گے۔"

ساتواں مطلب: رجعت کی خصوصیت

متونِ دینی سے رجعت کی چند خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں:

۱۔ رجعت کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت اشخاص اپنی اسی مادّی (دنیوی) شکل وصورت میں دنیا کے طرف پلٹائے جائیں گے۔

۲۔ رجعت کی دوسری خصوصیت، مومنینِ خالص کے لیے اس کا اختیاری اور مشرکین و ملحدین (منکرین خداوند) کے کچھ افراد کے لیے اس کا اجباری ہونا ہے، جیسا کہ مفضّل بن عمر، امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتا ہے کہ:

"ذَكَرنا القائِمَ ومَن مات مِن أصحابِنا يَنتَظِرُه فقال لنا ابوعبدالله عليه السلام: اذا أقامَ أتى المُؤمِن في قَبرِه فيُقال له: يا هذا أنّه قد ظَهَر صاحِبُك فإنْ تَشاءُ أن تُلحِقَ به فَالْحَقْ وإن تَشاءُ أن تقيمَ في كرامةِ ربِّك فأَقِمْ۔" (31)

مفضل کہتا ہے کہ ہم نے (امام صادق علیہ السلام سے) حضرت قائم علیہ السلام کے بارے میں اور اپنے اُن بعض اصحاب وساتھیوں کے بارے میں، جو اُن کے ظہور کے منتظر تھے اور مر گئے، گفتگو کی تو ہم سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"جب وہ (ظہور فرمائیں گے اور) قیام کریں گے تو اللہ کے فرشتے صاحبِ ایمان شخص کی قبر پر آئیں گے اور کہیں گے، تمہارے مولی اور صاحب نے ظہور کر لیا ہے، اگر چاہتے ہو ان کے ساتھ ملحق ہو جاؤ، تو ملحق ہو جاؤ اور اگر چاہتے ہو اپنے پروردگار کی کرامت میں باقی رہو تو ٹھہرے رہو۔"

۳۔ رجعت کی تیسری خصوصیت، اس کے زمانے کا نامشخص اور غیرِ معیّن ہونا ہے، جیسا کہ حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کا زمانہ بھی معلوم نہیں ہے۔

علّامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں:

"فَلَمّا أخبَرَهم رسولُ الله ﷺ ما يَكونُ مِن الرَّجعةِ قالوا مَتىٰ يكونُ هذا قال اللهُ تعالىٰ: قُلْ [يا محمّد ﷺ] إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَّا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا۔" (32) و (33)

"جس وقت رسولِ خدا ﷺ لوگوں کو رجعت کے واقعات کی نسبت آگاہ فرما رہے تھے، تو اصحاب نے عرض کیا: رجعت کس زمانے میں وقوع پذیر ہوگی؟ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر وحی نازل فرمائی: کہہ دیجئے کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وعدہ قریب ہی ہے یا ابھی خدا کوئی اور مدّت بھی قرار دے گا۔"

آٹھواں مطلب: رجعت اور معاد (قیامت) میں فرق

اس لحاظ سے کہ "رجعت" کا معنیٰ مومنین اور کافرین کے کچھ افراد کا زندہ ہونا ہے، تاکہ اپنے اعمال کی جزاء وسزا تک پہنچ جائیں، ممکن ہے کہ بعض یہ گمان کریں کہ رجعت، معاد و قیامت کے حوادث ہی کا ایک حصّہ ہے، اس لیے ضروری و مناسب ہے کہ اِن دونوں کے فرق کو کامل طور پر واضح اور روشن کیا جائے:

۱۔ رجعت اس جہان (مادّی) میں، ان ہی مشخّصات اور عوارض کے ساتھ صورت پذیر ہوگی، جبکہ معاد ایک دوسرے جہان (معنوی) میں تحقّق پذیر ہوگی، جس میں عوارضِ مادّی کی کوئی خبر ہی نہیں ہے۔

۲۔ رجعت مومنینِ خالص اور کافرینِ خالص کے ساتھ مخصوص ہے، جبکہ معاد (قیامت) میں تمام مخلوقات حساب وکتاب کے لیے محشور ہوں گی۔

۳۔ رجعت کا عقیدہ، شیعوں کے ساتھ اختصاص رکھتا ہے، جبکہ معاد دینِ اسلام، بلکہ تمام اَدیانِ الٰہی کی ایک اصل کے طور پر قابلِ قبول ہے۔

۴۔ رجعت کے زمانے میں دنیا کی طرف بازگشت کرنے والے دوبارہ مر جائیں گے یا قتل کر دیئے جائیں گے، لیکن معاد میں موت کا کوئی تصوّر نہیں ہے، کیونکہ وہ جاودانگی اور ہمیشگی کا ٹھکانہ ہے۔

دوسری فصل: رجعت عقل کی نظر سے

پہلا مطلب: رجعت کے واقع ہونے کا امکان

مسئلۂ رجعت اور دنیا کی طرف بازگشت، قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جانے کے ساتھ مکمل طور پر مشابہت رکھتا ہے اور یہ دونوں حوادث (رجعت و قیامت) کاملاً یکسانیت رکھتے ہیں، البتہ اس فرق کے ساتھ کہ رجعت محدود اور قیامت سے پہلے وقوع پذیر ہوگی، جبکہ قیامت میں تمام انسان محشور ہوں گے اور اپنی اَبدی (واُخروی) زندگی کا آغاز کریں گے۔ بنابرایں، جو لوگ قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جانے

کے امکان کو قبول کر چکے ہیں، چاہیے کہ رجعت، یعنی اسی جہان میں دوبارہ زندگی دیئے جانے کے امکان کو بھی قبول کریں۔

معاد (قیامت) ایک مسلمان فرد کی نظر میں قرآنی و روائی تعلیمات کی رُو سے، جسمانی اور عنصری ہے، یعنی انسان کی روح اسی مادّی بدن میں عود کرے گی پس اگر اس طرح کی بازگشت عالمِ قیامت میں کسی بھی اشکال کے بغیر ہے، تو طبیعتاً روح کی اسی مادّی بدن کی طرف بازگشت، قیامت سے پہلے اسی مادّی جہان میں بھی کسی بھی مانع کے بغیر ہو سکتی ہے۔

بہ الفاظِ دیگر انسان دو جزءِ اصلی، روح اور بدن سے تشکیل پایا ہے، اس طرح کہ اس کے وجود کی حقیقت کو روح تشکیل دیتی ہے اور انسان کی زندگی کا تعلّق بھی روح ہی کے ساتھ ہے، یہی روح ہے جو موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور قیامت کے دن دوبارہ بدن کی طرف پلٹا دی جائے گی۔ روح کا وجود اور اُس کا موت کے ساتھ بدن سے جدا ہونا، ایسی چیز ہے جو دیندار دانشوروں اور آسمانی شریعتوں کے پیروکاروں کے نزدیک قابلِ قبول اور عقلی دلائل و فطری تقاضوں سے کاملاً ہم آہنگ رہی ہے۔

پس روح ہر گز نہیں مرتی اور موت سوائے روح کا بدن سے تعلّق ختم ہونے کے، کوئی اور چیز نہیں ہے اور اس تعلّق کا منقطع ہونا، روزِ قیامت تک جاری رہے گا اور اُس دن جب خداوندِ قادرِ مطلق تمام مخلوقات کو زندہ کرے گا، ایک بار پھر یہ روح بدن کی طرف پلٹائے دی جائے گی اور بے جان جسم حیاتِ نو سے آراستہ ہو جائے گا۔

لہٰذا رجعت اور قیامت کی مکمل شباہت کے پیشِ نظر اور قیامت کے قطعی و یقینی ہونے کے ساتھ، رجعت کا ممکن ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

دوسرا مطلب: مُردوں کا زندہ ہونا

رجعت کے عقلی امکان کی تحقیق و جستجو کرنے کے بعد، مُردوں کے زندہ ہونے کے چند نمونے، جن کی طرف قرآنِ کریم نے بھی اشارہ کیا ہے، پیش کرتے ہیں:

ا۔ قرآنِ کریم ایک پیغمبرِ خداؑ کے بارے میں، جن کا گزر ایک ایسے گاؤں کے پاس سے ہوا جس کے در و دیوار منہدم ہو چکے تھے اور کھنڈرات کے درمیان وہاں کے رہنے والوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے بکھرے پڑے تھے، بیان کرتا ہے کہ انہوں نے خود سے پوچھا:

"اللہ تعالیٰ کس طرح ان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا؟"

اللہ تعالیٰ نے انہیں سو سال کے لیے موت دیدی، پھر زندہ کیا اور پوچھا: "کتنے عرصہ (سوئے) رہے؟ انہوں نے عرض کیا: "ایک دن یا اس کا کچھ حصّہ! اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "نہیں! بلکہ سو سال تم پر اسی طرح گزر گئے ہیں۔۔۔۔"

"أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا۔۔۔أَنَّ اللهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ"[1]۔(34)

۲۔ قرآن مجید ایک اور مورد میں ایک ایسے گروہ کا ذکر کرتا ہے کہ جو موت کے خوف سے (مفسرین کے مطابق طاعون کی بیماری کا بہانہ بنا کر انہوں نے میدانِ جہاد میں شرکت سے اجتناب برتا تھا) اپنے گھروں (اور دیار) سے باہر نکل گئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی موت کا حکم دے دیا اور پھر دوبارہ اُن کو زندہ کیا۔

"أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ۔۔۔لَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ"[2]۔ (35)

اگرچہ بعض مفسرین(36) کیونکہ اس طرح کے غیر عادی حادثے کے واقع ہونے کو تحمّل نہیں کر سکتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کو ایک مثال کے طور پر لیا ہے، لیکن واضح ہے کہ اس طرح کی تأویلات آیت کے ظہور، بلکہ صراحت کے مقابلے میں قابلِ قبول نہیں ہیں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کے ایک اور مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے ایک گروہ کی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے دیدار اور دیکھنے کے خواہشمند تھے اور اُن کی یہ نامناسب خواہش، اُن پر عذابِ الٰہی نازل ہونے اور اُن کی موت کا سبب بن گئی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔

---

1 ۔ترجمہ: "یا اس شخص کی طرح جس کا ایک ایسی بستی سے گزر ہوا جو اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی تو اس نے کہا: اللہ اس (اجڑی ہوئی آبادی کو) مرنے کے بعد کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ پس اللہ نے سو(۱۰۰) برس تک اسے مردہ رکھا پھر اسے دوبارہ زندگی دی، اس سے پوچھا: بتاؤ کتنی مدت (مردہ) رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا اس سے کم، اللہ نے فرمایا (نہیں) بلکہ سو(۱۰۰) برس (مردہ) پڑے رہے ہو، لہٰذا ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو جو سڑی نہیں اور اپنے گدھے کو بھی دیکھو اور ہم نے یہ اس لیے کیا ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور پھر ان ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم انہیں کس طرح اٹھاتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں، یوں جب اس پر حقیقت عیاں ہو گئی تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔"

2 ۔ترجمہ: "کیا آپ نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکلے تھے؟ اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ، پھر انہیں زندہ کر دیا، بے شک اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔"

"وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَى لَن نُّؤْمِنَ ۔۔۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ" [3]۔(37)

اگرچہ بیضاوی(38) "بعث" کے کلمۂ کو "موت" کے ساتھ مقیّد کرنے کو اس چیز کی علامت قرار دیتا ہے کہ کبھی انسان بیہوشی یا نیند کے بعد بیدار ہوتا ہے۔ لیکن اہل سنّت کے دوسرے مشہور و معروف مفسرین، جیسے: زمخشری(39) ، محمد بن جریر طبری(40) ، جلال الدین سیوطی(41) ، ابنِ کثیر(42)اور فخر رازی(43) سب اقرار کرتے ہیں کہ وہ لوگ آسمانی بجلی گرجنے سے مرگئے تھے اور حتیٰ کہ بعض قائل ہیں کہ ان کی یہ موت ایک شب و روز تک جاری رہی اور پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو دوبارہ زندہ کیااور انہوں نے اپنی زندگی گزاری۔

۴۔ قرآنِ کریم ایک اور شخص کے قصّے کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اپنے ہی قریبی رشتہ داروں کے ہاتھوں مخفیانہ طور پر قتل کردیا گیا اور اُس کے قاتلوں نے نامردانگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک دوسرے (قبیلے کے) فرد پر اُس کے قتل کا الزام لگا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وحی فرمائی کہ ایک مادہ گائے کو ذبح کریں اور اس کا ایک حصّہ مقتول کے بدن پر لگائیں تاکہ مقتول زندہ ہو اور اپنے قاتل کی شناخت اور پہچان کروائے۔

"وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْساً ۔۔۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ۔" (44)

ترجمہ: "اور (یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کردیا اور اس کے قاتل کے بارے میں جھگڑا کرنے لگے، جبکہ خدا اس راز کا واضح کرنے والا ہے جسے تم چھپا رہے تھے۔ تو ہم نے کہا کہ مقتول کو گائے کا ٹکڑے سے مس کردو (تاکہ وہ زندہ ہو اور اپنے قاتل کی پہچان کروائے) خدا اسی طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھلاتا ہے کہ شاید تمہیں عقل آجائے۔"

اس آیتِ شریفہ کے ذیل میں اہل سنّت کے مفسّرین، جیسے: سیوطی، طبری اور ابنِ کثیر بہت سی روایات نقل کرتے ہیں کہ اس کام کے نتیجے میں مقتول زندہ ہوا اور اُس نے اپنے قاتل کا نام لیا اور پھر (دوبارہ) دنیا سے رخصت ہوا۔

---

3 ۔ترجمہ: "اور (یاد کرو وہ وقت) جب تم نے کہا: اے موسیٰؑ ! ہم آپ پر ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم خدا کو علانیہ نہ دیکھ لیں، اس پر بجلی نے تمہیں گرفت میں لے لیا اور تم دیکھتے رہ گئے۔ پھر تمہارے مرنے کے بعد ہم نے تمہیں اٹھایا کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ۔"

۵۔ قرآنِ کریم حضرتِ عیسیٰؑ کے معجزات اور اُن پر الٰہی نعمتوں کو شمار کرنے کے ضمن میں فرماتا ہے:

وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوتَىٰ بِإِذْنِي۔ (45)

ترجمہ: "اور مُردوں کو میرے اذن (اور حکم) سے زندہ کرتے تھے۔"

یہ تعبیر ظاہر کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اس (مُردوں کو زندہ کرنے کے) معجزے سے استفادہ کرتے تھے، بلکہ خود فعلِ مضارع "تُخْرِجُ" اس فعل کی تکرار پر دلیل ہے۔

ان پانچ موارد کے علاوہ، دوسرے بہت سے موارد، جیسے: اصحابِ کہف کے زندہ ہونے کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چار پرندوں (کو زندہ کرنے) کی داستان بھی رجعت کے مسئلے میں قابلِ ملاحظہ ہیں۔ بہر حال جو شخص بھی قرآنِ کریم کو ایک آسمانی کتاب کے عنوان سے قبول کرتا ہے، اِن واضح اور روشن آیات کے ہوتے ہوئے رجعت کے "امکان" سے انکار نہیں کر سکتا، کیونکہ رجعت موت کے بعد، دوبارہ زندگی کی طرف بازگشت کے کوئی اور چیز نہیں ہے۔

رجعت کے امکان کی بہت سی دلیلیں، اِس کے واقع ہونے اور نیز اس بارے میں روایات کی تفصیل کے ساتھ تحقیق اور جانچ پڑتال مرحوم شیخ حرّ عاملیؒ (46) اور فضل بن شاذان نیشاپوری (47) نے انجام دی ہے۔

تیسری فصل: رجعت قرآن کی نظر سے

گزشتہ اُمّتوں کے درمیان رجعت کے امکان اور واقع ہونے کو ثابت کرنے کے بعد، اِس حصّے میں اُن آیاتِ قرآن کی تحقیق و جانچ پڑتال کریں گے جو روایات اور شیعہ مفسّرین کے اقرار کی بنیاد پر صراحت کے ساتھ رجعت پر دلالت کرتی ہیں۔

پہلا مطلب: حضرت علیؑ کی بازگشت کی خبر

وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ أَنَّ النَّاسَ كَانُوا بِآيَاتِنَا لَا يُوقِنُونَ * وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّن يُكَذِّبُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ (48)

ترجمہ: "اور جب ان پر وعدہ پورا ہوگا تو ہم زمین سے ایک چلنے والا نکال کر کھڑا کر دیں گے جو اُن سے یہ بات کرے کہ کون لوگ ہماری آیات پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اُس دن ہم ہر اُمّت میں

سے ایسے گروہ کو محشور کریں گے جو ہماری آیتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے اور پھر وہ الگ الگ تقسیم کر دیئے جائیں گے۔"

یہ آیت اُن مشہور ترین آیات میں سے ایک ہے کہ تفاسیر روائی (منقول) اور غیر روائی کے مطابق، "وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا" سے مقصود، رجعت کا دن ہے۔(49)

نیز اسی طرح شیعوں کی اکثر تفاسیر روائی، امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ روایت نقل کرتی ہیں کہ پیغمبرِ گرامی اسلام ﷺ نے فرمایا: "دابۃُ الارض" سے مقصود حضرت علی علیہ السلام ہیں۔ مفسّرِ بزرگوار مرحوم سید ہاشم بحرانیؒ امام جعفر صادق علیہ السلام سے بہت سی روایات نقل کرنے کے ضمن میں نقل کرتے ہیں:

"فقالَ الرَّجلُ لأبی عَبدِ اللهِ علیه السلام: إنّ العامَّةَ تَزعَمُ ـ ـ ـ فهِیَ: «وَحَشَرْناهُمْ فَلَمْ نُغادِرْ مِنْهُمْ أَحَداً»" (50) و(51)

یعنی "ایک شخص نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: اہل سنّت یہ خیال و گمان کرتے ہیں کہ "وہ دن جب ہم ہر اُمّت سے ایک گروہ کو محشور کریں گے" سے مقصود روزِ قیامت ہے! امامؑ نے فرمایا: کیا قیامت کے دن ہر اُمّت سے ایک گروہ کو محشور گیا جائے گا اور باقی افراد کو چھوڑ دیا جائے گا؟ نہیں! ایسا نہیں ہے! بلکہ یہ آیت روزِ رجعت کے بارے میں ہے اور قیامت کے بارے میں ایک دوسری آیت ہے، جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور ہم اُن سب (انسانوں) کو محشور کریں گے اور اُن میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔"

مرحوم شیخ طبرسیؒ اس روایت کو بیان کرنے کے ضمن میں کہ "دابۃُ الارض" سے مقصود حضرت امیر المومنین علیہ السلام ہیں، فرماتے ہیں: "خاندانِ وحی و رسالت کے مذہب کے پیروکاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ آیتِ شریفہ: "وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا" اصلِ رجعت کو بیان کرتی ہے اور انہوں نے رجعت کو ثابت کرنے کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔۔۔، اس کے علاوہ بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں کہ خداوند متعال حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت لوگوں کے اُن گروہوں کو جو دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں، (دوبارہ) زندہ کرے گا۔(52)

علّامہ طباطبائیؒ باوجود اس کے کہ بحثِ روائی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت کی بنیاد پر "دابۃُ الارض" سے مقصود حضرت علی علیہ السلام ہی کو قرار دیتے ہیں، لیکن بحثِ تفسیری میں لکھتے ہیں:

"قرآنِ کریم کی آیاتِ میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اِس آیت کی تفسیر کر سکتی ہو اور بیان کرے کہ یہ چلنے والی مخلوق، جس کو اللہ تعالیٰ عنقریب زمین سے خارج کرے گا، کیا ہے؟ اور کن خصوصیات کی مالک ہے؟ اس کی صفات وعلامات کیا ہیں؟ اور لوگوں سے کس طرح کلام کرے گی؟ کیسے زمین سے باہر آئے گی اور کیا کہے گی؟ بلکہ آیت کا سیاق اس بات پر بہترین دلیل ہے کہ یہاں مقصود مبہم گوئی ہے اور مذکورہ جملہ قرآن کے مرموز اور اسرار آمیز کلمات میں سے ہے۔"

لیکن علّامہ آیت "وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا" کے ذیل میں بعض مفسّرین کے اشکالات کو، کہ اس آیت سے مراد "روزِ قیامت" ہے، ردّ کرنے کے ضمن میں اس طرح فرماتے ہیں:

"ظاہر آیت سے واضح ہے کہ اُس دن کا محشور ہونا روزِ قیامت کے علاوہ ہے، کیونکہ روزِ قیامت میں محشور ہونا، ہر اُمّت سے ایک گروہ کے ساتھ اختصاص نہیں رکھتا، بلکہ تمام اُمّتیں اُس دن محشور ہوں گی، حتیٰ کہ آیت "وَحَشَرْناهُمْ فَلَمْ نُغادِرْ مِنْهُمْ أَحَداً" کے مطابق ایک نفر بھی نہیں چھوٹے گا، جبکہ اس آیت میں فرماتا ہے: "ہم ہر اُمّت سے ایک گروہ کو محشور کریں گے۔" (53)

دوسرا مطلب: زمانِ رجعت میں پیغمبروںؑ کی نُصرت

إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ۔ (54)

"بیشک ہم اپنے رسول ﷺ اور ایمان لانے والوں کی زندگانی دنیا میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس دن بھی مدد کریں گے جب سارے گواہ اُٹھ کھڑے ہوں گے۔"

مرحوم فیض کاشانیؒ اس آیت شریفہ کے ذیل میں اس مضمون کی ایک روایت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

"وعَنِ الصّادق علیه السلام ذَلِكَ وَاللهِ فِي الرَّجْعَةِ أَمَا۔۔۔ وذَلِكَ فی الرَّجعَةِ" (55)

یعنی "خدا کی قسم! یہ آیت رجعت کے بارے میں ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں قتل کر دیئے گئے اور اللہ تعالیٰ کی نُصرت اُن کو نہیں پہنچی؟ اُن کے بعد آئمہ ھدیٰ علیہم السلام بھی قتل کر دیئے گئے اور نُصرتِ خدا ان کے بھی شامل حال نہ ہوئی، (لہٰذا) یہ آیت رجعت میں تحقّق پذیر ہو گی۔"

یہ آیت اس چیز کا اظہار کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ دیا ہے کہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام اور مومنین کی اسی دنیا میں نُصرت اور مدد فرمائے گا اور کیونکہ اس طرح کی نُصرت گزشتہ زمانے میں وقوع پذیر نہیں ہوئی ہے، پس یقیناً آئندہ وقوع پذیر ہو گی، چونکہ وعدۂ الٰہی تخلُّف ناپذیر ہے اور دوسری طرف کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے علاوہ تمام انبیاء علیہم السلام دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اس دنیا میں نُصرت و مدد بھی نہیں کئے گئے، لہٰذا ضروری ہے کہ دوبارہ زندہ ہوں، تاکہ اسی دنیا میں نُصرت کئے جائیں۔

تیسرا مطلب: عصرِ ظہور میں بازگشت کرنے والوں کی حکومت

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ۔۔۔ فَأُوْلَـٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (56)

ترجمہ: "اللہ نے تم میں سے صاحبانِ ایمان اور اعمالِ صالح والوں سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا اور ان کے لیے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا کہ وہ سب صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے اور اس کے بعد بھی کوئی کافر ہو جائے تو در حقیقت وہی لوگ فاسق اور بد کردار ہیں۔"

شیعہ مفسّرین کی قریب باتفاق اکثریب اس آیت کو ظہورِ حضرت مہدی علیہ السلام اور نیز بعض مفسّرین روزِ رجعت کے ساتھ تفسیر کرتے ہیں۔ مرحوم طبرسیؒ اس آیتِ شریفہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"بعض نے کہا ہے یہ آیت اصحابِ نبیؐ کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت اُمّتِ پیغمبر اکرم ﷺ کے بارے میں ہے، ابن عباس، مجاہد اور اہل بیت علیہم السلام سے مروی قول یہ ہے کہ یہ آیت مہدیِ آلِ محمد علیہ السلام کے بارے میں ہے۔" (57)

بحرانی ؒ اس آیت شریفہ کے ذیل میں امام محمد باقر علیہ السلام سے اور وہ اپنے جدّ بزرگوار علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

"وإنَّ لِيَ الْكَرَّةَ بَعدَ الكرّةِ وَالرَّجْعَةُ بَعدَ الرَّجعَةِ وأنَا صَاحِبُ الْكرّاتِ والرَّجعاتِ۔۔۔" (58)

"اور میرے لیے بازگشت کے بعد بازگشت اور رجعت کے بعد رجعت ہے اور میں کئی بازگشت اور کئی رجعت کا مالک ہوں۔۔۔"

چوتھا مطلب: عصرِ ظہور میں حضرت عیسیٰؑ مسیح کی حضرت مہدیؑ کی اقتداء

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلاَّ لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا۔ (59)

"اور کوئی اہلِ کتاب میں ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام اس کے گواہ ہوں گے۔"

اس آیت شریفہ کے ذیل میں تمام اہم شیعہ تفاسیر، جیسے: تفسیرِ علی ابن ابراہیم قمی (60)، تفسیرِ مجمع البیان (61)، تفسیرِ برہان (62)، اور تفسیرِ صافی (63) یہ روایات نقل کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت تشریف لائیں گے اور حضرت مہدی علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ البتہ شیعہ عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا سے رخصت نہیں ہوئے اور ابھی زندہ ہیں، لیکن رجعت کے لیے اِس آیت سے استدلال، اس وجہ سے ہے کہ بعض اہلِ سنّت کے علماء آیتِ شریفہ:

"إِذْ قَالَ اللّهُ يَا عِيسَى إِنِّي مُتَوَفِّيكَ۔۔۔ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ"[4]۔ (64)

اس آیت کے ظاہر کی بنیاد پر استناد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح قبض ہو گئی اور وہ دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں، لہٰذا یہ آیتِ شریفہ ان کی رجعت پر دلالت کرتی ہے۔ جلال الدین

4۔ ترجمہ: "جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ اب میں تمہاری مدت پوری کر رہا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھانے والا ہوں اور تمہیں کافروں (کی ناپاک سازشوں) سے پاک کرنے والا ہوں اور جو لوگ تمہاری پیروی کریں گے انہیں قیامت تک کفر اختیار کرنے والوں پر بالادست رکھوں گا، پھر تم لوگوں کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے، پھر اس وقت میں تمہارے درمیان (ان باتوں کا) فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔"

سیوطی (65) اور اہلِ سنّت کے دوسرے مفسّرین، اس بارے میں بہت سی روایات نقل کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ پلٹائے جائیں گے اور کوئی یہودی یا عیسائی باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ اُن کے مرنے سے پہلے اُن پر ایمان لے آئے گا۔

چوتھی فصل: رجعت روایات کی نظر سے

پہلا مطلب: روایاتِ رجعت کے بارے میں محدّثین کی آراء

رجعت کے بارے میں معصومین علیہم السلام سے جو اخبار اور روایات نقل ہوئی ہیں، اس قدر زیادہ ہیں کہ قطعی طور پر ان کے متواتر ہونے کو قبول کیا جاسکتا ہے۔ علمِ حدیث کی بعض بزرگ اور صاحبِ نظر شخصیات اس طرح کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں:

۱۔علّامہ مجلسیؒ:

"وکَیفَ یَشُكُّ مُؤمنٌ بحقیةِ الائمۃِ الأ۔۔۔ خَمسینَ مِن مُؤلّفاتِهِم۔" (66)

یعنی "کوئی بھی صاحبِ ایمان کس طرح دوسو(۲۰۰) کے قریب صریح احادیث کے ہوتے ہوئے، جن کو چالیس سے زائد موثّق اور قابل اعتماد علماء اور بزرگانِ دین نے اپنی پچاس(۵۰) سے زیادہ تصنیفات میں تواتر کے ساتھ آئمہ اطہار علیہم السلام سے نقل کیا ہے، شک و تردید کرسکتا ہے۔"

علّامہ مجلسیؒ تقریباً تینتالیس(۴۳) اشخاص کے نام ذکر کرتے ہیں کہ جن میں سلیم بن قیس (متوفی ۹۰ق)، حسن بن صفار (متوفی ۲۹۰ق)، علی بن ابراہیم قمی، استادِ ثقۃ الاسلام کلینیؒ (متوفی ۳۲۸ق)، محمد بن مسعود عیاشی (معاصرِ کلینی)، ابو عمرو کشی (معاصرِ کلینی)، شیخ صدوقؒ (متوفی ۳۸۱ق)، شیخ مفیدؒ (متوفی ۴۱۳ق)، سید مرتضیٰ (متوفی ۴۳۶ق)، ابوالفتح کراجکی (متوفی ۴۴۹ق)، ابوالعباس احمد بن عباس نجاشی (متوفی ۴۵۰ق)، شیخ طوسیؒ (متوفی ۴۶۰ق) اور سید رضی بن طاوٗس (متوفی ۴۶۴ق) شامل ہیں۔
علّامہ مجلسیؒ مزید لکھتے ہیں:

"وإذا لَم يَكُن مِثلُ هَذا مُتَواتراً فَفِي أَيّ شَيءٍ يُمكِن دَعوىٰ التَّواتُر مَع مَا رَوَته كَافةُ الشِّيعةِ خَلفاً عَن سَلفٍ وظَنِّي أَنَّ مَن يَشُكُّ فِي أَمثَالِها فَهُو شَاكٌّ فِي أَئِمَةِ الدِّينِ ولَا يُمكِنُهُ إظهارُ ذَلِكَ مِن بَينِ المُؤمِنينَ" (67)

یعنی "وہ روایات جو رجعت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں اور تمام شیعہ اکابرین اور بزرگانِ دین، نسل در نسل اُن کو نقل کرتے رہے ہیں، اگر ان روایات کو متواتر تسلیم نہ کیا جائے، تو کسی بھی دوسری چیز میں تواتر کا دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے، اور میرے خیال میں جو شخص اس طرح کی (متواتر) روایات میں شک وتردید کا شکار ہو، تو اس نے آئمہ علیہ السلام اور دینی پیشواؤں کے بارے میں شک کیا ہے اور کوئی بھی مومنین کے درمیان سے ایسے دعوے کا اظہار نہیں کر سکتا ہے۔"

۲۔ محدّث حرّ عاملیؒ:

محدّثِ بزرگوار شیخ حرّ عاملیؒ اس بارے میں اس طرح فرماتے ہیں:

"ولَا رَيبَ فِي بُلوغِ الأَحادِيثِ المَذكورَةِ حَدَّ التَّواتُرِ المَعنَوي بِدَليلِ ايجابِها لليَقينِ لِكُلِّ مَن خَلا قَلبُهُ مِن شُهبَةٍ أو تَقلِيدٍ وبدليلِ جَزمِ العَقلِ وباستَحالَةِ تَواطُئِ جَميعِ رُواتِها عَلى الكِذبِ وبدليلِ الاستقراءِ والتَّتَبُّعِ للأخبارِ الَّتي يَذكُرونَ أنَّها مُتواترةٌ معنىً" (68)

یعنی "کوئی شک وتردید نہیں کہ رجعت کی روایات واحادیث تواترِ معنوی کی حدّ تک پہنچ جائیں، کیونکہ یہ روایات ہر اُس شخص کے لیے، جس کا دل شک وشبہ اور تقلید سے خالی ہو، یقین و قطع اور جزمِ عقلی کا موجب بنتی ہیں اور دوسری جانب یہ کہ تمام راویوں کا جھوٹ اور کذب پر اکٹھے ہونا محال ہے اور نیز اسی طرح ان مذکورہ احادیث کے استقراء اور جانچ پڑتال کی بنیاد پر ان کو متواتر معنوی پایا ہے۔"

شیخ حرّ عاملیؒ آخرِ کتاب میں دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے چھ سو بیس (۶۲۰) سے زائد روایات اور آیات اس بارے میں ذکر کی ہیں:

"فقد ذَكَرنا فِي هَذِهِ الرِّسالةِ مِن الأحاديثِ والايات والأدلّةِ ما يَزيدُ على سِتَّةِ ماةٍ وعِشرينَ ولَا أظُنُّ شَيئاً مِن مَسائلِ الأُصولِ والفُروعِ يُوجَد فِيه مِنَ النُّصوصِ أكثَرَ مِن هَذِهِ المَسألةِ"

یعنی "ہم نے اس کتاب میں چھ سو بیس (۶۲۰) سے زائد احادیث، روایات اور ادلّہ ذکر کی ہیں اور میں گمان نہیں کرتا کہ کسی بھی اصولی یا فروعی مسئلے میں اس سے زیادہ نصوص پائی جاتی ہوں۔" (69)

دوسرا مطلب: تقسیم بندی روایات

رجعت کے بارے میں واردہ روایات کی اجمالی شناخت اور کلی معرفت کے لیے ان روایات کو پانچ حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلا گروہ: امام حسین علیہ السلام کی بازگشت کی خبر

پہلا حصّہ اُن روایات پر مشتمل ہے، جو یہ بیان کرتی ہیں کہ سب سے پہلے دنیا کی طرف بازگشت کرنے والے امام حسینؑ بن علی علیہما السلام ہوں گے، زید شحام امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"أوّلُ مَن یَکرُّ فی رَجعَتِهِ الحسینُ بنُ علی علیهما السلام یَنکُتُ فِی الارْضِ حَتَّی یَسقُطُ حاجِباہ عَلی عَیْنَیْهِ" (70)

یعنی "پہلے شخص جو دنیا میں بازگشت فرمائیں گے، امام حسین علیہ السلام ہیں، وہ اس قدر زمین میں ٹھہریں گے (اور زندگی گزاریں گے) کہ آپؑ کی دونوں آبروئیں (بڑھاپے کی وجہ سے) آنکھوں پر آجائیں گی۔"

دوسرا گروہ: پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کی بازگشت کی خبر

دوسرا حصّہ اُن روایات کو شامل ہے جن کا مضمون پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت علی علیہ السلام کی بازگشت کے بارے میں ہے، بکر بن اعین کہتا ہے: وہ (امام محمد باقر علیہ السلام) جن کی بات میں مجھے کوئی شک وتردید نہیں ہے، انہوں نے مجھ سے فرمایا:

"اِنَّ رَسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَأمیرَالمُومِنینَ علیه السلام سَیَرجعانِ" (71)

یعنی "بیشک رسولِ خدا ﷺ اور امیر المومنین علیہ السلام عنقریب دنیا کی طرف بازگشت فرمائیں گے۔"

تیسرا گروہ: پیغمبروںؑ کی بازگشت کی خبر

تیسرا حصّہ وہ روایات ہیں جو گذشتہ پیغمبروںؑ کی بازگشت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ عبداللہ بن مسکان امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کرتا ہے کہ انہوں نے قرآنِ کریم کی اِس آیتِ کریمہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرمایا:

" وَإِذْ أَخَذَ اللّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّيْنَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُواْ أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُواْ وَأَنَاْ مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ" (72)

ترجمہ: "اور جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کردوں پھر آئندہ کوئی رسول تمہارے پاس آئے اور جو کچھ تمہارے پاس ہے اس کی تصدیق کرے تو تمہیں اس پر ضرور ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنا ہوگی، پھر اللہ نے پوچھا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور میری طرف سے (عہد کی) بھاری ذمہ داری لیتے ہو؟انہوں نے کہا: ہاں! ہم نے اقرار کیا، اللہ نے فرمایا: پس تم گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

"مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيّاً مِن لَدُن آدم وهَلُمَّ جَرّاً اِلّا ويَرجعُ الی الدُّنيا فيَنصُرُ رَسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وأميرَالمُومِنينعليه السلام" (73)

یعنی "خداوند متعال نے آدمؑ سے لے کر (خاتم الانبیاءؐ تک) دوسرے کسی نبی کو مبعوث نہیں فرمایا مگر یہ وہ دنیا کی طرف بازگشت کریں گے اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی علیہ السلام کی نُصرت کریں گے۔"

چوتھا گروہ: دابۃُ الارض کی تفسیر

روایات کا چوتھا حصّہ یہ بیان کرتا ہے: کہ اُن چیزوں میں سے ایک جو قیامت سے پہلے زمین سے باہر نکلے گی "دابۃُ الارض" ہے اور اَحادیث میں "دابۃُ الارض" کو امیر المومنین علی علیہ السلام سے تفسیر کیا گیا ہے، جس کی پہلے تاریخی پس منظر میں وضاحت کی جاچکی ہے۔

پانچواں گروہ: آیاتِ رجعت کی تفسیر

روایات کا پانچواں حصّہ رجعت و بازگشت سے مربوط آیات کی تفسیر اور تشریح کرتا ہے۔ ابو خالد کابلی امام سجّاد علیہ السلام سے اِس آیتِ شریفہ:

"إِنَّ الَّذِی فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ" (74)

ترجمہ: "بیشک جس نے آپؐ پر قرآن کا فریضہ عائد کیا ہے وہ آپؐ کو آپ کی منزل تک ضرور واپس پہنچائے گا۔"

اس کی تفسیر نقل کرتا ہے کہ امام سجّاد علیہ السلام نے فرمایا:

"یَرجِعُ اِلَیکم نَبِیُّکم وَأمِیرُالمُومِنِینَ علیہ السلام والأئمۃُ علیھم السلام" (75)

یعنی "تم لوگوں کی طرف تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیہ السلام اور آئمہ معصومین علیہم السلام بازگشت کریں گے۔"

علّامہ مجلسیؒ بہت سی آیات نقل کرتے ہیں جو آئمہ معصومین علیہم السلام کے بیان میں بازگشت کے ساتھ تفسیر کی گئی ہیں۔ (76)

تیسرا مطلب: دعاؤں اور زیارات میں رجعت کا استعمال

مطمئن ترین منابع اور مأخذ میں سے ایک کہ جن میں رجعت کی تصریح کی گئی ہے، آئمہ معصومین علیہم السلام سے وارد ہونے والی دعائیں اور زیارات ہیں، یہاں اُن میں سے فقط بعض کے کچھ جملے پیش کرتے ہیں:

۱۔ زیارتِ جامعہ کبیرہ: "مُعْتَرِفٌ بِکُم، مُؤمِنٌ بِاِیَّابِکُم، مُصَدِّقٌ بِرَجْعَتِکُم، مُنْتَظِرٌ لِأَمْرِکم، مُرتَقِبٌ لِدَوْلَتِکم"

۲۔ زیارت رسولِ خداؐ: "اِنِّی لَمِنَ القائِلِینَ لِفَضْلِکم، مُقِرٌّ بِرَجْعَتِکم"

۳۔ زیارت امام حسینؑ: "اِنِّی مِنَ المُؤمِنِینَ بِرَجْعَتِکم"

۴۔ زیارتِ وارث: "اِنِّی بِکُم مُؤمِنٌ وَبِاِیّابِکم مُوقِنٌ"

۵۔ زیارتِ اربعین: "وأَشْهَدُ أَنِّی بِکُم مُؤمِنٌ وبِاِیّابِکم مُوقِنٌ"

۶۔ زیارت حضرت ابوالفضلؑ: "اِنّی بِکم وبِاِیّابِکم مِنَ المُؤمِنِینَ"

۷۔ زیارتِ بقیۃ اللہؑ: "وأَن يَجْعَلَ لِي كَرَّةً فِي ظُهُورِكَ وَرَجْعَةً فِي أَيَّامِكَ"

۸۔ زیارتِ آل یاسین: "وانَّ رَجْعَتَكم حَقٌّ لَا رَيْبَ فِيهِ"

۹۔ زیارتِ رجبیہ: "حَتَّى الْعَوْدِ اِلى حَضْرَتِكم وَالْفَوْزِ فِي كَرَّتِكم"

نیز اسی طرح دعائے عہد، ماہ رمضان المبارک کی راتوں کی دعاؤں، دعائے افتتاح، ماہ رمضان المبارک کے بعض دنوں کی دعاؤں اور صحیفہ سجّادیہ کی بعض دعاؤں، بلکہ اکثر دعاؤں اور زیارتوں میں رجعت کا تذکرہ ہوا ہے، جبکہ اُن میں سے بعض میں آئمہ معصومین علیہم السلام کی رجعت کا اقرار اور بعض میں حضرتِ مہدی علیہ السلام کی حکومت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ سے بازگشت اور رجعت کی دعا مانگی گئی ہے۔(77)

چوتھا مطلب: بازگشت کرنے والوں کے نام

بازگشت کرنے والوں کے ناموں کے بارے میں اور یہ کہ رجعت (کے زمانے) میں کون سے لوگ بازگشت کریں گے؟ بہت سی روایات ہم تک پہنچی ہیں، اُن میں پیغمبروں کی رجعت، جیسے: اسماعیل بن حزقیلؑ، حضرتِ عیسیٰؑ، حضرت خضرؑ، پیغمبرِ گرامی اسلام ﷺ اور نیز امیر المومنین علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور دوسرے آئمہ معصومین علیہم السلام کی بازگشت اور نیز پیغمبرِ اسلام ﷺ کے بعض اصحاب کی بازگشت، مانند: جنابِ سلمان، مقداد، جابر بن عبداللہ انصاری، ابودجانہ انصاری، مالک اشتر اور نیز مفضّل بن عمر، حمران بن اعین، مؤمن آل فرعون، یوشع بن نون اور اصحاب کہف کی بازگشت کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

اِن مذکورہ موارد میں سے ہر ایک اُن روایات کی استناد کی بنیاد پر بیان کئے گئے ہیں، جن کو زیادہ تفصیل کے ساتھ مفصّل کتابوں میں دیکھا اور تلاش کیا جاسکتا ہے۔(78)

پانچویں فصل: شبہات کی جانچ پڑتال اور اُن کا جواب

مسئلۂ رجعت کے بارے میں اہم ترین مباحث میں سے ایک، وہ اشکالات اور شبہات ہیں جو اس عقیدے کے منکرین کی طرف سے شک وتردید پیدا کرنے کے لیے بیان کئے جاتے ہیں، یہاں ہم چند اہم شبہات کی وضاحت کرتے ہیں اور پھر ان کا جواب اور ردّ پیش کرتے ہیں:

۱۔ رجعت ابنِ سباء کا من گھڑت عقیدہ

ایک شبہہ جو اہلِ سنّت کے بعض مفسّرین کی طرف سے بیان کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ عقیدۂ رجعت ''عبداللہ بن سباء'' کے جعلی اور من گھڑت افکار کا نتیجہ ہے اور وہ ادّعا کرتے ہیں کہ اِس عقیدے کی دینی متون اور تعلیمات میں کوئی بنیاد اور اساس نہیں ہے۔

سید محمود آلوسی، جو تیرہویں ہجری قمری کے مفسّرین میں سے ہیں، سورۂ نمل، آیت ۸۳ "وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِن كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"أَقُولُ: أَوّلُ مَن قالَ بالرَّجعَةِ عَبدُالله بنِ سَبَا ولَكِنْ خَصَّها بِالنَّبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وَتَبِعَهُ الجابرُ الجُعفی فِی أَوّلِ المِأةِ الثانيةِ فقالَ برجعَةِ الأميرِ(كرّم الله وجهَهُ) اَيضاً لَكِن لَم يوقتها بوَقتٍ ولمّا أتىَ القَرنُ الثالثُ قرّرَ أهلُه مِنَ الاماميةِ رجعه الائمة كلّهم وأعدائهم وعَيّنوا لذَلِكَ وقتَ ظُهورِ المَهْدی عليه السلام استَدَلّوا علی ذلِك بما رووه عن أئمةِ اهلِ البيتِ" (79)

یعنی ''میں یہ سمجھتا ہوں کہ پہلا شخص جو اس عقیدۂ رجعت کا معتقد تھا، وہ ''عبداللہ بن سباء'' تھا، لیکن اُس نے اس رجعت کی نسبت فقط پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دی تھی، پھر اس کی پیروی کرتے ہوئے دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں جابر جعفی نے امیر المومنین علی علیہ السلام کی رجعت کا بھی کہا، لیکن اُس نے (بھی) اِس کا زمانہ مشخص و معین نہ کیا اور جب تیسری صدی ہجری آئی تو مذہبِ امامیہ والوں نے تمام آئمہؑ اور اُن کے دشمنوں کی رجعت کو ثابت کیا اور اِس کا زمانہ ظہور حضرت مہدی علیہ السلام کا وقت معیّن کیا اور اِس (عقیدے) پر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی روایات سے استدلال کیا۔''

نیز اسی طرح ''احمد امین مصری'' بھی تفکّرِ تشیّع کے مبداءِ پیدائش کی نسبت ''عبداللہ بن سباء'' کی طرف دینے کے بعد، عبداللہ بن سباء کی مشہور ترین تعلیمات اور افکار کو وصایت (اور ولایتِ حضرت علی علیہ السلام) اور رجعت قرار دیتا ہے اور نقل کرتا ہے کہ عبداللہ بن سباء نے کہا:

"مجھے تعجّب ہے کہ کوئی شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بازگشت کی تو تصدیق کرتا ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کی بازگشت کو جھٹلائے؟" (80)

اِس شبہ کی جانچ پڑتال اور جواب

اس بات کے پیشِ نظر کہ اِس اشکال اور اعتراض کی بنیاد ''عبداللہ بن سباء'' نامی شخص کے وجود پر استوار ہے، لہٰذا ایسے کسی شخص کے عدمِ وجود کو ثابت کرنے کے ساتھ ہی اِس اشکال کی بنیاد اور اساس منہدم ہو جائے گی۔ بعض مؤرّخین کے مطابق، ''عبداللہ بن سباء'' یمن کے شہر صنعاء کا ایک یہودی شخص تھا، جو تیسرے خلیفہ عثمان بن عفّان کی خلافت کے زمانے میں ظاہری طور پر اسلام لایا، لیکن اُس کا ہدف مکر و فریب اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ اندازی تھا۔ اُس نے مسلمانوں کے درمیان مختلف عقائد کو رواج دیا، جن میں سے ایک عقیدۂ رجعت بھی ہے اور اُس کی یہی پیروی عثمان کے قتل اور جنگِ جمل کے شعلے بھڑکنے کا باعث بنی۔

لیکن اِس بارے میں بہترین اور جامع ترین تاریخی تحقیق ''محقّق علّامہ سید مرتضیٰ عسکریؒ'' نے انجام دی ہے۔ اُن کی تحقیقات کے مطابق، عبداللہ بن سباء کے مجموع راویوں کی تعداد کل بائیس (۲۲) نفر ہے، جو سب کے سب عبداللہ بن سباء کی داستان کو ''سیف بن عمرو'' سے نقل کرتے ہیں، البتہ اِس فرق کے ساتھ کہ اُن میں سے چار نفر بغیر کسی واسطے کے اور اٹھارا (۱۸) واسطے کے ساتھ ''سیف بن عمرو'' سے نقل کرتے ہیں۔

دوسری طرف سیف بن عمرو جو ۱۷۰ھ ہجری کے بعد دنیا میں آیا، خود اہلِ سنّت کی رجالی کتابوں میں اُس کی توثیق نہیں کی گئی ہے، بلکہ اُسے جھوٹ اور کفر کے ساتھ متّہم کیا گیا ہے۔ اِن میں سے یحییٰ بن معین (متوفی ۲۳۲ ق)، نسائی (متوفی ۳۰۳ق)، ابوداوٗد (متوفی ۲۷۵ق) اور ابو حیان (متوفی ۳۵۴ق) کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نیز حاکم نیشاپوری، فیروزآبادی، ابنِ حجر اور سیوطی بھی اِس کی حدیثوں کو ضعیف اور متروک سمجھتے ہیں۔ (81)

بنابرایں، آلوسی اور احمد امین مصری کی تمام گفتگو کا استناد، وہ روایات ہیں جو سیف بن عمرو سے نقل ہوئی ہیں اور خود اہلِ سنّت کے علمِ رجال و حدیث کے علماء کے اظہارِ نظر کے مطابق یہ "سیف بن عمرو" کسی قسم کی نقلِ حدیث کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس کی تمام روایات ہر قسم کی تاریخی ارزش اور اہمیت سے فاقد ہیں۔

علاوہ یہ کہ کس طرح رجعت کے عقیدے کو "عبداللہ بن سباء" کی فکری تراوشات سے سمجھا اور اُس کو اس عقیدے کا بانی قرار دیا جاسکتا ہے، جبکہ وہ (اگر اُس کے وجود کو تسلیم بھی کرلیں) خلیفۂ سوم کی خلافت کے زمانے میں تازہ اسلام لاتا ہے، لیکن خود خلیفۂ دوم نے پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ابتدائی لمحات میں یہ کہا تھا:

"نبی اکرم ﷺ نہیں مرے ہیں اور حتما لوٹ کر آئیں گے، اگر کسی نے کہا کہ پیغمبر ﷺ مر گئے ہیں تو میں اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ دونگا۔" (82)

خلیفہ کی اس بات کا مطلب، اگر یہ لیا جائے کہ اُن کے کہنے کے مطابق پیغمبر ﷺ فوت نہیں ہوئے، تو یہ ایک امرِ بدیہی اور تمام اصحاب کی نظر کے خلاف اور خلیفہ کی شان و منزلت اور ادارک سے بعید ہے۔ پس ضروری ہے کہ اُن کی یہ بات پیغمبر اکرم ﷺ کی رجعت اور بازگشت پر محمول کی جائے۔ بنابرایں، خلیفہ دوم نے عبداللہ بن سباء سے پہلے رجعت کو بیان کیا ہے۔

سب سے اہم یہ کہ اس روایت کے مطابق، جو پہلے بیان ہوچکی ہے، حضرت علی علیہ السلام کی آخری زمانے میں رجعت اور بازگشت کی خبر دی گئی ہے اور اِس عقیدۂ رجعت کو سب سے پہلے بیان کرنے والی خود پیغمبر اکرم ﷺ کی ذاتِ والا صفات ہے۔

۲۔ عقیدۂ رجعت برخلاف قرآن

ایک اور شبہہ جس کو آلوسی نے بھی بیان کیا ہے، وہ عقیدۂ رجعت کی آیات قرآن کے ساتھ مخالفت ہے:

"وفِي الْآيَاتِ مَا يَأْبَى ذَلِكَ، مِنهُ قَولُه تَعالىٰ: قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ * لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ" (83) و(84)

یعنی "آیاتِ قرآن اِس عقیدے (رجعت) کا انکار اور اِس کی نفی کرتی ہیں، ان میں سے ایک یہ آیت ہے کہ خداوند متعال فرماتا ہے: کہنے لگا کہ میرے پروردگار مجھے پلٹا دے۔ شاید میں اب

کوئی نیک عمل انجام دوں، جسے میں نے ترک کر دیا۔ (لیکن اُسے کہا جائے گا) ہر گز نہیں! یہ ایک بات ہے جو یہ کہہ رہا ہے اور ان کے پیچھے ایک عالمِ برزخ ہے جو قیامت کے دن تک قائم رہنے والا ہے۔"

آلوسی آگے چل کر لکھتا ہے:

"فانَّ آخرَ الآیۃِ ظاھِرٌفِی عَدَمِ الرَجْعَۃِ مُطلَقاً"

"اِس آیت اور قرآن کریم کی دیگر آیات کے مطابق، خداوند متعال دنیا کی طرف بازگشت کی نفی کرتا ہے، بالخصوص آیت شریفہ کا آخر بطورِ مطلق رجعت کے نہ ہونے میں ظہور رکھتا ہے، اگرچہ اصلِ رجعت ممکن اور خداوند کی قدرتِ مطلقہ کے ماتحت ہے، لیکن بحث اُس کے واقع ہونے میں ہے، جس کی قرآن نفی کرتا ہے۔" (85)

اِس شبہہ کی جانچ پڑتال اور جواب

اِس شبہہ اور اشکال کا منشأ رجعت کے بارے میں شیعہ کے درست عقیدے سے عدمِ آگاہی ہے، کیونکہ جس رجعت اور بازگشت کا شیعہ عقیدہ رکھتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مؤمنوں کا مخصوص گروہ اور ظالموں و کافروں کا مخصوص گروہ، حضرت مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت اپنے پروردگار کے اِس وعدے کو پورا کرنے کے لیے کہ امام زمانہ علیہ السلام کی نُصرت و مدد اور اُن کی حکومت کو درک کرنے ثواب اور نیز تاریخ کے ستمگروں، ظالموں اور کافروں کو انتقام لیئے جانے کے لیے پلٹایا جائے۔

اس طرح کی بازگشت، مذکورہ بالا آیت شریفہ سے موردِ انکار واقع نہیں ہوئی ہے، بلکہ سورۂ مومنون کی آیت ۹۹ اور ۱۰۰ اُن بعض مشرکین کی، جو اپنے ننگین اور گھٹیا اعمال کی اصلاح کے لیے پلٹنا چاہتے ہیں، بازگشت کا شدیداً انکار کرتی ہے۔ بنابرایں، آیتِ شریفہ ایک خاص قسم کی بازگشت کی نفی کرتی ہے کہ جس کا شیعوں کے عقیدۂ رجعت سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ کہ مذکورہ بالا آیت، رجعت کی نفی میں کسی بھی طرح کی عمومیت بطورِ کلی نہیں رکھتی کہ شیعوں کی اصطلاحی رجعت کو شامل ہوسکے، لہٰذا رجعت اصطلاحی سے اس کا کوئی تعلّق نہیں ہے۔

۳۔ رجعت کا واقع ہونا ہدفِ معاد کے منافی

بعض اصلِ رجعت کو ممکن تو سمجھتے ہیں، لیکن اِس کے وقوع پذیر ہونے سے معاد و قیامت کے، جو کہ دین کے مسلّمہ اور قطعی اصول میں سے ایک ہے، بے فائدہ اور لاحاصل ہو جانا خیال کرتے ہیں، کیونکہ دنیا میں رجعت کے بعد ظالموں اور جابروں کے مجازات اور مومنوں کے اَجر و ثواب کے ساتھ، معاد و قیامت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

اِس شبہہ کی جانچ پڑتال اور جواب

اِس اعتراض کے جواب میں اولاً تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر دنیا میں تھوڑے سے افراد کا مجازات ہونا، معاد کے بے فائدہ ہونے کا باعث ہو سکتا ہے، تو لازم آتا ہے کہ حدود شرعی کا اجراء بھی اسی قسم کا ہو، جبکہ ایسا نہیں ہے اور کسی نے اس طرح کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے۔

ثانیاً: جیسا کہ مکرّر بیان ہو چکا ہے کہ آیات و روایات کی بنیاد پر رجعت عمومی نہیں ہے، بلکہ تھوڑے سے لوگ بازگشت کریں گے اور مجازات ہوں گے۔ جبکہ رجعت اُس صورت میں قیامت کے بُطلان کا موجب ہے کہ عمومی پہلو رکھتی ہو۔

ثالثاً: دنیوی عذاب، ستمگروں اور ظالموں کے جرم و جنایات کے متناسب اور برابر نہیں ہے، نیز رجعت کے بعد جو عذاب چکھیں گے وہ بھی معاد و قیامت کے عذاب کے مقابلے میں بہت کم اور ناچیز ہے، بلکہ وہ اپنے ظلم و ستم کے متناسب اور واقعی عذاب کو روزِ قیامت ہی دیکھیں گے۔

۴۔ رجعت سنّتِ الٰہی کے برخلاف

بعض یہ کہتے ہیں کہ رجعت، سنّتِ الٰہی کے برخلاف ہے، کیونکہ سنّتِ الٰہی یہ جاری و ساری رہی ہے کہ انسان رُشد و پیشرفت کے راستے پر رحمِ مادر سے دنیا میں متولّد ہو اور کچھ مدّت کے بعد اس جہان سے آنکھیں بند کرلے اور پھر دوبارہ قیامت کے دن زندہ ہو۔

اِس شبہہ کی جانچ پڑتال اور جواب

قرآنِ کریم سے گزشتہ اُمّتوں کے متعدّد نمونے ملاحظہ کرنے کے بعد اس طرح کے کسی شبہہ و اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، کیونکہ قرآنِ کریم صراحت کے ساتھ اُن لوگوں کے نام بیان کرتا ہے، جو مرنے کے بعد قیامت سے پہلے دوبارہ زندہ ہوئے ہیں۔

۵۔ رجعت، تناسُخ کی ایک قسم

بعض مدّعی ہوئے ہیں کہ رجعت تناسُخ ہی کی ایک قسم ہے اور کیونکہ تناسُخ قابلِ قبول نہیں ہے، پس رجعت بھی مردود ہے۔

اِس شبہہ کی جانچ پڑتال اور جواب

تناسُخ چار قسم کا ہوتا ہے: بشری اور انسانی بدنوں میں تناسُخ، حیوانات کے جسموں میں تناسُخ، بناتات میں تناسُخ اور جمادات میں تناسُخ (86)۔ رجعت اِن اقسام میں سے کسی بھی قسم کے ساتھ سازگار اور مناسب نہیں ہے، پس تناسُخ باطل ہونے کے ساتھ، رجعت مردود نہیں ہے۔

بحث کا ماحصل اور نتیجہ

تمام گفتگو اور بحث کا نتیجہ و ماحصل یہ ہے کہ رجعت، مؤمنینِ خالص کی ایک جماعت اور کافرین محض و خالص کی ایک جماعت کی دنیا میں قیامت برپا ہونے سے پہلے، حضرتِ مہدی علیہ السلام کے ظہور اور قیام کے وقت بازگشت ہے، تاکہ مؤمنین اُن کی عالمی اور جہانی حکومت کا مشاہدہ کرکے خوشحال اور کافرین موردِ انتقام اور عذاب واقع ہوں۔

اُن اَدلّہ کی بنیاد پر جو بیان ہوئیں، رجعت حتمی اور قطعی ہے اور شیعہ علماء کے اتفاق و اجماع کے علاوہ، روایات بطورِ تواترِ معنوی، نیز قرآنِ کریم کی چند آیات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں اور عقل کے نزدیک بھی اس کا ممکن ہونا محال نہیں ہے۔

رجعت کا عقیدہ مذہبِ شیعہ کی خصوصیات میں سے ہے، اگرچہ اس کی کچھ تفسیریں کی گئی ہیں: مانند یہ کہ حکومت اسلامی کی اہل بیت علیہم السلام کی طرف بازگشت کرنا، حضرتِ مہدی علیہ السلام کا شہادت یا انتقال کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، لیکن قریب بہ اتفاق شیعہ علماء کی نظر اور رائے، جو دینی تعلیمات سے مأخوذ ہے، یہ ہے کہ رجعت، مؤمنوں کے ایک (خاص) گروہ کی اَجر و پاداش حاصل کرنے اور حضرتِ مہدی علیہ السلام کی حکومت درک کرنے اور کافروں کی ایک جماعت کی عذاب کا مزہ چکھنے اور انتقام دیکھنے کے لیے حضرتِ مہدی علیہ السلام کے قیام کے وقت بازگشت ہے۔

روایات میں، رجعت کرنے والوں کے نام بھی بیان کئے گئے ہیں، جن میں پیغمبروںؑ کی ایک جماعت، اصحاب اور یارانِ پیغمبرِ اسلام ﷺ اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ خود پیغمبر اکرم ﷺ، حضرتِ علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1۔ محمد ابن اثیر جزری، النھایۃ فی غریب الحدیث والاثر، تحقیق: محمد الطناحی وطاہر احمد الزاوی، ج۲، ص۲۰۲؛ ابنِ منظور، لسان العرب، ج۵، ص۱۴۸

2۔ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار، ج۵۳، ص۱۲۲-۱۲۳

3۔ خلیل بن احمد فراہیدی، کتاب العین، تحقیق: ڈاکٹر مہدی مخزومی وڈاکٹر ابراہیم سامرائی، ج۱، ص۲۲۶

4۔ احمد بن فارش بن زکریا، معجم مقاییس اللغۃ، تحقیق: عبدالسلام محمد ہارون، ج۲، ص۴۹۰

5۔ ابنِ منظور، لسان العرب، ج۵، ص۱۴۸

6۔ شیخ فخر الدین طریحیؒ، مجمع البحرین، ج۴، ص۳۳۳

7۔ سعید شرتونی لبنانی، اقرب الموارد، ج۱، ص۳۹۱-۳۹۲

8۔ علی اکبر دھخدا، لغت نامہ، حرفِ ''راء'' ص۲۹۴

9۔ سابقہ حوالہ، ص۲۹۵

10۔ سابقہ حوالہ

11۔ محمد تقی مصباح یزدی، جامعہ وتاریخ، ص۱۴

12۔ محمد بن الحسن، شیخ حر عاملیؒ، الایقاظ من الھجعۃ بالبرھان علی الرجعۃ، ص۲۹

13۔ محمد بن محمد بن نعمان عکبرائی شیخ مفیدؒ، اوائل المقالات، ص۵۰

14۔ سورۂ نمل، آیت ۸۲

15۔ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار، ج۵۳، ص۵۲

16۔ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین صدوقؒ، معانی الاخبار، ص۳۶۶؛ علّامہ محمد باقر مجلسیؒ، بحار الانوار، ج۵۳، ص۶۳

17۔ سید محمد حسین طباطبائیؒ، تفسیر المیزان، ج۱۲، ص۲۳-۲۴

18۔ علّامہ مجلسیؒ، بحار الانوار، ص۹۲

19۔ سابقہ حوالہ، ص۱۲۱
20۔ عبداللہ شبرؒ، حق المتقین، ج۲، ص۳۳۵
21۔ جعفر سبحانی، محاضرات فی الالھیات، ج۴، ص۲۸۹
22۔ سید عدنان البکاء، الامام المھدی المنتظر، ص۳۳۰۸
23۔ سید محسن خرازی، بدایۃ المعارف الالھیۃ، ج۲، ص۱۶۸
24۔ محمد بن حسن طوسیؒ، الغیبۃ، تحقیق: شیخ عباداللہ تہرانی و شیخ علی احمد ناصح، ص۴۲۲
25۔ سید عدنان البکاء، سابقہ حوالہ
26۔ سید ہاشم بحرانیؒ، البرھان فی تفسیر القرآن، ج۴، ص۵۳۶
27۔ سورۂ توبہ، آیت ۳۳
28۔ علّامہ مجلسیؒ، سابق، ص۶۴
29۔ سابقہ حوالہ، ص۵۰
30۔ قمی، شیخ عباسؒ، سفینۃ البحار، ج۳، ص۳۱۵
31۔ علّامہ مجلسیؒ، سابقہ حوالہ، ص۹۱
32۔ سورۂ جن، آیت ۲۵
33۔ علّامہ مجلسیؒ، سابقہ حوالہ
34۔ سورۂ بقرہ، آیت۲۵۹
35۔ سابقہ حوالہ، آیت ۲۴۳
36۔ سید محمد رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم (تفسیر المنار)، ج۲، ص۴۵۶-۴۵۷
37۔ سورۂ بقرہ، آیت۵۵-۵۶
38۔ عبداللہ بن عمر بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التأویل (تفسیر بیضاوی)، ج۱، ص۶۳
39۔ جاراللہ محمود بن عمر زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوہ التأویل، ج۱، ص۲۷۱
40۔ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی، الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ج۱، ص۳۲۹،
41۔ الدر المنثور، ج۱، ص۱۷۰
42۔ اسماعیل ابن کثیر قرشی دمشقی، تفسیر القرآن العظیم، ج۱، ص۹۷
43۔ محمد بن عمر فخر رازی، مفاتیح الغیب، ج۳، ص۸۶
44۔ سورۂ بقرہ، آیت ۷۲-۷۳

45۔ سورۂ مائدہ، آیت ۱۱۰
46۔ محمد بن الحسن حر عاملیؒ، الایقاظ من الھجعۃ بالبرھان علی الرجعۃ، ابواب ۲ و ۴ و ۵
47۔ فضل بن شاذان نیشاپوریؒ، الایضاح، ص ۳۸۱-۴۲۷
48۔ سورۂ نمل، آیت ۸۲-۸۳
49۔ مولی محسن فیض کاشانیؒ، تفسیر صافی، ج ۴، ص ۷۴-۷۵
50۔ سورۂ کہف، آیت ۴۷
51۔ البرھان فی تفسیر القرآن، ج ۶، ص ۳۶
52۔ ترجمہ مجمع البیان، ج ۱۰، ص ۴۵۰
53۔ ترجمہ تفسیر المیزان، ج ۱۵، ص ۵۶۷-۵۶۹
54۔ سورۂ مومن (غافر)، آیت ۵۱
55۔ تفسیر صافی، ج ۴، ص ۳۵۴
56۔ سورۂ نور، آیت ۵۵
57۔ مجمع البیان، ج ۴، ص ۱۵۲
58۔ سید ہاشم بحرانیؒ، تفسیر برھان، ج ۵، ص ۴۱۹
59۔ سورۂ نساء، آیت ۱۵۹
60۔ علی بن ابراہیم قمیؒ، تفسیر القمی، ج ۱، ص ۱۵۸
61۔ فضل بن حسن طبرسیؒ، مجمع البیان، ج ۳، ص ۲۱۱
62۔ البرھان فی تفسیر القرآن، ج ۲، ص ۱۹۷
63۔ تفسیر صافی، ج ۱، ص ۵۱۸
64۔ سورۂ آل عمران، آیت ۵۵
65۔ الدر المنثور، ج ۲، ص ۲۳۳-۲۴۳
66۔ بحار الانوار، ج ۵۳، ص ۱۲۲
67۔ سابقہ حوالہ، ص ۱۲۳
68۔ الایقاظ من الھجعۃ بالبرھان علی الرجعۃ، ص ۲۳
69۔ سابقہ حوالہ، ۴۳۰
70۔ سابقہ حوالہ، ۳۵۸

71۔ سابقہ حوالہ، ۳۷۹

72۔ سورۂ آل عمران، آیت ۸۱

73۔ الایقاظ من الھجعۃ بالبرھان علی الرجعۃ، ص ۳۳۲؛ بحار الانوار، ج ۵۳، (باب رجعت)، احادیث ۹-۲۰-۲۳ و ۶۶

74۔ سورۂ قصص، آیت ۸۵

75۔ حسن بن سلیمان حلی، مختصر البصائر، تحقیق: مشتاق المظفر، ص ۳۴۱

76۔ بحار الانوار، ج ۵۳، باب رجعت

77۔ آیۃ اللہ سید محمد میر شاہ ولد، شیعہ و رجعت، بخش ادعیہ و زیارات

78۔ خادمی شیرازی، رجعت یا دولت کریم خاندان وحی، ص ۱۶۶-۲۰۰

79۔ سید محمود آلوسی بغدادی، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی (تفسیر آلوسی)، ج ۲۰، ص ۲۷

80۔ محمد رضا ضمیری، رجعت از دیدگاہ عقل و نقل، ص ۶۰، مجلّہ موعود

81۔ سید مرتضٰی عسکریؒ، عبداللہ بن سبا و اساطیر اخری، ج ۱، ص ۳۵-۳۷

82۔ جعفر سبحانی، بحوث فی الملل والنحل، ج ۶، ص ۳۶۳

83۔ سورۂ مومنون، آیت ۹۹-۱۰۰

84۔ سید محمود آلوسی، تفسیر آلوسی، ج ۲۰، ص ۲۷

85۔ سابقہ حوالہ

86۔ محمد بن ابراہیم صدر المتألھین شیرازیؒ، اسفار اربعہ، ج ۹، ص ۲

حضرت محمد ﷺ: امن وآشتی کے پیکر

ڈاکٹر عباس حیدر زیدی*

abbaspsc@yahoo.com

کلیدی کلمات: جہادی کلچر، غزوات، سریے، ہجرت، سیرتِ طیبہؐ، صحابہ کرام میں جدائی۔

خلاصہ

موجودہ دور میں اسلام دشمن عناصر بعض مسلمان نمالوگوں کے ہاں پائے جانے والے جہادی کلچر کا سبب، رسول اکرم ﷺ کے دور کی جنگوں کو قرار دے رہے ہیں۔ان کے نزدیک اِس جہادی کلچر کو قرآن وسنّت سے فروغ ملا ہے۔ لیکن اِس پروپیگنڈا کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کو رحمت للعالمین قرار دیا ہے اور آپ ﷺ کو دنیا میں امن وآشتی کا پیغام پھیلانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا آپؐ کی سیرت میں ہمیشہ رحم، عفو ودرگذر، صلح وآشتی، امن وامان ملتا ہے۔ آپؐ نے تو ایک ایسے معاشرے میں امن کا اصول متعارف کرایا جہاں معمولی باتوں پر ایک دوسرے کا خون بہانا عام تھا۔

باقی رہا صدرِ اسلام میں لڑی جانے والی جنگوں کا تعلق ہے تو تاریخ اسلام کے مطابق آپؐ کی اکثر جنگیں دفاعی تھیں۔ مکی زندگی میں مسلمانوں کی مشرکین مکہ سے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ہجرت کے بعد مشرکین کو اسلام کے پھیلاؤ کا خطرہ محسوس ہوا تو اُنہوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگیں شروع کردیں۔ لیکن آپؐ نے ان جنگوں میں بھی عدل وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہمیں سیرت طیبہ سے درس ملتا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی تصور کریں حتیٰ اہل کتاب کا بھی احترام کریں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم آج ان تمام نام نہاد مسلمانوں کا بائیکاٹ کریں جو اپنے علاوہ کسی اور کو مسلمان ہی تصور نہیں کرتے اور ان پر کُفر کے فتوے لگا کر ان کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں۔

* ۔پی۔ایچ۔ڈی، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی۔

مقدمہ

آج کا مسلم معاشرہ جس دور انحطاط سے گزر رہا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم معاشرے کی زوال پذیری میں بعض ایسے عوامل کارفرما رہے ہیں کہ جن کی وجہ سے معاشرے کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ دشمن نے یہ حربہ بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ مسلمانوں میں جہادی کلچر کے فروغ میں رسول اکرم ﷺ کی جنگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی پھیلائی گئی کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا۔

چنانچہ مخالفین اسلام رسول اکرم ﷺ کے دور میں لڑی جانے والی جنگوں کو ثبوت کے طور پر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ قتال کریں چنانچہ ان کے مطابق مسلمانوں میں جہادی کلچر کو فروغ دینے میں قرآن مجید کا بھی اہم کردار رہا ہے۔ جب قرآن کی اس آیت پر نظر پڑتی ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ خود رسول اکرم ﷺ کے بارے میں ارشاد فرماتا ہے کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ۔

ترجمہ: ہم نے آپ کو عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (1)

تو یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے دور میں کئی جنگیں لڑیں لیکن اس کے باوجود رسول ﷺ کی ذات عالمین کے لئے کیسے رحمت بن گئی۔اس بات کا جواب یہی ہے کہ اللہ نے رسول اکرم ﷺ کو دنیا میں امن وآشتی کا پیغام دینے اور اسلام کے راستے ایک خدا کی عبادت کرنے کے لئے بھیجا تھا لیکن مخالفین اسلام نے اللہ کی رحمت سے استفادہ نہیں کیا اور جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اگر ہم رسول اکرم ﷺ کے دور میں لڑی جانے والی جنگوں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام جنگوں میں بیشتر جنگیں ایسی تھیں کہ جو دفاعی نوعیت کی تھیں۔یعنی مشرکین نے یہ جنگیں خود شروع کی تھیں لہٰذا رسول اللہ ﷺ کو بھی اسلام اور مسلمانوں کے دفاع کے لئے جنگیں لڑنا پڑیں۔اگر تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک رسول اللہ ﷺ مکہ مکرمہ میں رہے اس وقت

تک مشرکین مکہ سے مسلمانوں کی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔مکہ میں رسول اکرم ﷺ کو جو تکالیف پہنچائی گئیں اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے اس بات نے رسول اکرم ﷺ کو مجبور کیا کہ آپ مکہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ اللہ کے حکم سے آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔مشرکین مکہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی جلد بیخ بنی نہیں کی تو اسلام بہت جلد تمام عرب اور اس کے قرب و جوار میں پھیل جائے گا۔چنانچہ مشرکین کی جانب سے جنگوں کا آغاز ہوتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے کبھی بھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ مشرکین کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں اور وہ اسے قبول نہ کریں تو اسے موت کے گھاٹ اُتارنے کا حکم صادر کریں۔رسول اکرم ﷺ کی سیرت ہمیشہ رحم، عفو و درگذر، صلح و آشتی، امن و امان کی متقاضی رہی۔آپؐ تمام کائنات کے لئے رحمت بن کر تشریف لائے تھے۔رحمت کا تقاضی تھا کہ انسان اپنے ہی بنائے ہوئے بتوں کے آگے سر جھکانے کے بجائے اپنے خالق کے سامنے سر جھکائے۔

رسول اکرم ﷺ نے اسلامی اصولوں کو عرب کے اس معاشرے میں متعارف کرایا جہاں معمولی باتوں پر ایک دوسرے کا خون بہانا عام بات تھی۔اسلام سے قبل عرب کے قبائل معمولی باتوں پر ایک دوسرے سے لڑپڑتے تھے اور بعض اوقات یہ معمولی لڑائی ایک ہولناک جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔عرب میں یہ لڑائیاں کئی نسلوں تک جاری رہتی تھیں۔رسول اکرم ﷺ نے اسلام کی تعلیمات کے ذریعے انہیں آپس میں ملا دیا اور ایک دوسرے کے ساتھ اخوت و بھائی چارے کا درس دیا۔آپؐ کو اگرچہ مشرکین مکہ کے طرف سے مسلسل جنگوں کا سامنا رہا لیکن کبھی بھی آپؐ نے عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات ''میں کہا ہے کہ ان غزوات کی تعداد ستائیس]۲۷[ہے، جن میں رسول اکرم ﷺ نے خود شرکت کی اور ان سریوں کی تعداد سینتالیس]۴۷[ہے، جن میں آپؐ نے خود شرکت نہیں کی بلکہ اپنے بجائے صحابہ کرامؓ میں سے کسی کو اس سریے کا سپہ سالار بنا کر بھیجا۔یہ سریے جو تیس، چالیس، پچاس اور کبھی کبھی دو سو افراد پر مشتمل ہوتے تھے۔ان کا مقصد ہر گز مشرکین سے جنگ

کرنا نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ مشرکین مکہ کے جانب سے ہونے والی کسی بھی فوجی کاروائی سے پہلے ان پر نظر رکھ سکیں اور ساتھ ہی ان پر اپنا رعب وداب قائم کر سکیں۔

سریے مخالفین اسلام کو متنبہ کرنے کے لئے تھے کہ اب رسول اکرم ﷺ کو مدینہ میں ایسی قوت و طاقت ہو چکی ہے کہ جس کے ذریعے وہ کفار کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔بہت سے سریے ایسے بھی ہیں کہ جنہیں رسول اکرم ﷺ نے مختلف علاقوں کی طرف بھیجا اور جن میں جنگ نہیں ہوئی، جیسے : حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کو تیس افراد جو کہ مہاجر تھے اور ان میں کوئی بھی انصاری نہیں تھا، کے ہمراہ ایک سریہ پر عیص کے علاقے میں سمندر کے کنارے بھیجا۔(2)

عبداللہ بن جحشؓ کی قیادت میں آٹھ مہاجرین کو کہ جن میں کوئی بھی انصاری نہیں تھا ایک سریہ نخلہ کی طرف بھیجا کہ جس کا مقصد یہ تھا کہ قریش کی کمین میں بیٹھ کر ان کے بارے میں اطلاعات حاصل کی جا سکیں۔(3)

بعض افراد کو آپؐ نے مختلف قبائل کی طرف بھیجا لیکن جب انہوں نے واپس آ کر ان کے قبول اسلام سے انکار کا ذکر کیا تو رسول اکرم ﷺ ان قبائل سے معترض نہیں ہوئے۔ جیسے : نمیلہ بن عبداللہ لیثی کو بنی ضمرہ کی طرف بھیجا۔وہ رسول اکرم ﷺ کے پاس واپس آ گیا اور کہا: یارسول اللہ ﷺ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس (رسول اکرم ﷺ) سے نہ لڑتے ہیں اور نہ صلح کرتے ہیں اور اسی طرح نہ اس کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب۔اس پر لوگوں نے کہا کہ ''یارسول اللہ اغزھم''یعنی ''یارسول اللہ ﷺ ان سے جنگ کریں'' لیکن رسول اکرم ﷺ جو عفو و درگذر کا پیکر تھے فرمایا: یعنی''دعوھم'' یعنی ''انہیں رہنے دو۔''(4)

اسی طرح عمرو بن امیہ ضمری کو بنی دیل کی طرف بھیجا۔وہ واپس آ گیا اور کہا: یارسول اللہ ﷺ امین نے دیکھا ہے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔میں ان کے پاس گیا اور انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے شدت سے انکار کر دیا۔اس پر لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ یارسول اللہ ﷺ ان سے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں تو آپؐ نے فرمایا:

دعوابنی الدیل۔

''یعنی''بنی دیل کو رہنے دو۔''(5)

یعقوبی نے اپنی تاریخ میں ایک عنوان قرار دیا ہے کہ :

الغزوات التی لم یکن فیھا قتال۔

یعنی ''غزوات جن میں جنگ نہیں ہوئی''۔(6)

اس کے ذیل میں انہوں نے غزوہ ابوائ، غزوہ بواط، غزوہ ذوالعشیرہ، غزوہ قرقرۃالکدر، غزوہ بدر صغریٰ اور غزوہ تبوک کا ذکر کیا ہے۔یعنی یہ وہ غزوات تھے کہ جن میں قتال نہیں ہوا۔جو آیتیں جہاد کی جانب اشارہ کرتی ہیں ان میں بھی عفو و درگذر کا درس اس طرح دیا گیا ہے کہ اگر مخالفین اسلام صلح کا مطالبہ کریں تو اسے قبول کرلیا جائے۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللهُ يَعْلَمُهُمْ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ۔

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

ترجمہ:"اور ان (کافروں)کے لئے جتنی تم کرسکتے ہو تیاری کروطاقت اور گھوڑوں کے ذریعے۔جس سے تم اللہ کے دشمنوں،اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ دوسروں پر ڈر بٹھا سکوگے۔تم ان کو نہیں جانتے ہو۔اللہ انہیں جانتا ہے۔تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کروں گے وہ تم کو پورا پورا دیا جائے گا۔ تمہاری حق تلفی نہیں کی جائے گی۔اگر وہ صلح کے لئے جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤاور اللہ پر بھروسہ کرو۔وہ بے شک سننے والااور جاننے والا ہے۔"(7)

یہ آیت بتاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو یہ حکم ان کافروں پر رعب ڈالنے کے لئے دیا گیا ہے کہ جو آپؐ اور اسلام کے بدترین دشمن تھے لیکن ساتھ ہی یہ آیت اس بات کی بھی صراحت کرتی ہے کہ اگر وہ لوگ صلح کیلئے آمادہ ہوجائیں تو ان سے جنگ کے بجائے صلح کرلی جائے۔اسی طرح قرآن کی ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ :

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَسَى اللهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاللهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَأَشَدُّ تَنْكِيلًا۔

ترجمہ: "پس آپ اللہ کی راہ میں جنگ کیجئے اور آپ صرف اپنے آپ کے ذمہ دار ہیں۔البتہ مؤمنوں کو بھی آمادہ جہاد کیجئے۔ عنقریب اللہ ان لوگوں کی ہیبت سے جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے بچائے رکھے گا اور اللہ ہیبت میں بھی شدید ہے اور سزا دینے میں بھی شدید ہے۔"(8)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں رسول اکرم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کافروں کی ہیبت ختم کرنے کے لئے ان سے جنگ کریں نہ کہ ان لوگوں سے انتقام کے لئے یا ان لوگوں کو زبردستی اسلام کے دائرے میں لانے کے لئے ان سے جنگ کریں۔اللہ تعالیٰ قرآن کی ایک آیت میں ارشاد فرماتا ہے کہ

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا۔

ترجمہ: "اے مسلمانوں! ان کافروں کے ساتھ جنگ کرو، جو تمھارے ساتھ جنگ کرتے ہیں لیکن حد سے تجاوز نہ کرنا۔"(9)

اس آیت کریمہ میں خداوند عالم کہتا ہے کہ ان کافروں سے جنگ کی جائے تو تم سے جنگ کرتے ہیں لیکن اس میں بھی مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ حد سے تجاوز نہ کریں۔حد سے تجاوز نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے مخالفین سے بھی خیانت اور عہد شکنی نہیں کی جائے، ان کو مارنے کے بعد ان کے کان اور ناک نہ کاٹے جائیں اور نہ ہی بچوں کو قتل کیا جائے۔اسی لئے رسول اکرم نے جنگی حکمت عملی میں کچھ اصول و ضوابط کو بھی متعارف کروایا چنانچہ جب کوئی دستہ جنگ کے لئے روانہ کرتے تھے تو فرماتے :

اغزوا فی سبیل اللہ قاتلوا من کفر باللہ لا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا ولیدا۔

ترجمہ: "اللہ کے نام سے اللہ کے راستے میں جنگ کرو اور جو کوئی بھی اللہ کا کفر اختیار کرے اس سے جنگ کرو۔خیانت اور عہد شکنی نہ کرنا،کان اور ناک نہ کاٹنا اور بچے کو قتل نہ کرنا۔''(10)

رسول اللہ ﷺ نے اپنے نمائندے مختلف بادشاہوں جیسے خسرو، کسریٰ، ہرقل اور نجاشی کی طرف روانہ کیے اور انہیں خطوط لکھ کر اسلام کی طرف دعوت دی لیکن انہیں ایسی دھمکی ہرگز نہیں دی کہ اگر تم نے اسلام کو قبول کرنے سے انکار کیا تو ہم تم پر لشکر کشی کردیں گے۔ جب مکہ فتح ہوا تو بعض مسلمانوں کو یہ گمان پیدا ہوا کہ اب ہم مشرکین سے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا بدلہ لیں گے۔چنانچہ ایک صحابی سعد بن عبادہ نے انتقام کی خاطر تلوار بلند کی اور کہا:

الیوم یوم الملحمۃ۔

یعنی "آج کا دن گوشت کاٹنے کا دن ہے''۔(11)

لیکن جب رسول اکرم ﷺ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا کہ وہ ان کو روکیں۔ رسول اکرم ﷺ نے مکہ آنے کے بعد چند لوگوں کے علاوہ کہ جنہوں کچھ زیادہ ہی جرم کو ارتکاب کیا تھا بقیہ سب لوگوں کو عام معافی دینے کا اعلان کیا اور فرمایا:

فانی أقول کما قال أخی یوسف لاتثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم وھوارحم الراحمین۔

ترجمہ: "میں اپنے بھائی یوسف کی بات ہی کہوں گا کہ آج تمہارے اوپر کوئی سرزنش نہیں ہے خدا تمہیں معاف کرے اور وہ سب سے زیادہ مہربان ہے۔''(12)

رسول اکرم ﷺ نے مزید فرمایا:

اذھبوا فأنتم الطلقائ۔

ترجمہ: "جاؤ تم لوگ آزاد شدہ ہو۔''(13)

رسول اکرم ﷺ کی عفو و درگذر کی بے شمار مثالیں تاریخ سے اخذ کی جاسکتی ہیں ۔ہمیں رسول اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ سے یہ درس ملتا ہے کہ ہم سب مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی تصور کریں اور اہل کتاب کا بھی احترام کریں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم آج ان تمام نام نہاد مسلمانوں کا بائیکاٹ کریں جو اپنے علاوہ کسی اور کو مسلمان ہی تصور نہیں کرتے اور ان پر کُفر کے فتوے لگا کر ان کے قتل کو جائز سمجھتے ہیں یا خود کش حملہ کرکے یہ سمجھتے ہیں کہ سیدھے جنت میں جائیں گے۔

حوالہ جات

1 ۔ القرآن، الانبیائ، آیت ۱۰۷

2 ۔ طبری،تاریخ الطبری،مؤسسة الأعلمی للمطبوعات ۔ بیروت ۔ لبنان،قوبلت هذا الطبعة علی النسخة المطبوعة بمطبعة "بریل" بمدینة لندن فی سنة 1879م)ج2۔ص121

3 ۔ أحمد بن أبی یعقوب المعروف بالیعقوبی،تاریخ الیعقوبی،دار صادر ۔بیروت۔ لبنان۔ج ۲ - ص ۶۹

4 ۔ ایضاً۔ج ۲۔ص ۷۳

5 ۔ ایضاً۔ج ۲۔ص ۷۳

6 ۔ ایضاً۔ج ۲۔ص ۶۶

7 ۔ القرآن، الانفال، آیت ۶۰۔۶۱

8 ۔ القرآن،النسائ، آیت ۸۴

9 ۔القرآن، البقرة، آیت ۱۹۰

10 ۔ ابن عساکر،تاریخ مدینة دمشق،تحقیق:علی شیری،۱۴۱۵،دار الفکر۔بیروت ۔لبنان۔ج ۶۵ - ص۲۸۱

11 ۔ ابن الأثیر،الکامل فی التاریخ،۱۳۸۶ -۱۹۶۶ م،دار صادر ۔بیروت۔ج ۲ -ص ۲۴۶

12 ۔ جلال الدین السیوطی،الدر المنثور،دار المعرفة۔بیروت ۔لبنان۔ج ۴-ص ۳۴

13 ۔ حلبی،السیرة الحلبیة،۱۴۰۰،دار المعرفة،بیروت۔ج ۳ - ص ۴۹

هذه الطبعة علی النسخة المطبوعة بمطبعة "بریل" بمدینة لندن فی سنة۱۸۷۹م) ج ۲ - ص ۱۲

رضاعتِ پیغمبر کی روایتوں کا تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر سید حیدر عباس واسطی
dr.sha_wasti@gmail.com

کلیدی کلمات: سیرت طیبہ، حضرت آمنہؑ بنت، حمزہ بن عبدالمطلب، حلیمہ سعدیہ، ثوبیہ اسلمیہ، ابو لہب، ابو سفیان

خلاصہ

آنحضرتؐ کی رضاعت کے حوالے سے کتب سیرت میں آیا ہے کہ آپ نے اپنی والدہ کے علاوہ چند ایسی خواتین کا دودھ بھی پیا ہے جن کا موحد ہونا بھی ثابت نہیں ہے۔ کچھ حق شناس لوگوں نے ان روایات کو مسترد کیا ہے۔ اس مقالے میں اس معاملہ کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ اول، پہلے نظریے سے تعلق رکھنے والی روایتوں پر جرح و بحث کی گئی ہے اور پھر دوسرے نظریئے کی تائید میں کتب سیرت کے علاوہ قرآنی و عقلی ادلہ بھی پیش کی ہیں۔ ہم نے رضاعت پیغمبر ﷺ سے متعلق اُن کی روایتوں کو نقل کیا ہے جنہیں سب سے پہلے سیرت نگار محمد بن اسحٰق (متوفی ۱۵۱) نے بیان کیا ہے۔ ان روایتوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔

قرآن کا عام لوگوں کے لیے حکم ہے: مائیں اپنی اولاد کو دو برس کامل دودھ پلائیں گی جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے۔ اس آیت کی موجودگی میں سیرت نگاروں نے اللہ تعالیٰ کے محبوب پیغمبرؐ کو ان کی ماں کا دودھ پینے سے کیوں محروم رکھا ہے؟ قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مشکل حالات میں بھی انبیاء کے لیے اُن کی ماں کا دودھ مقدم رکھا۔ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا کہ اللہ نے اپنے کسی نبی کو اپنی والدہ کے دودھ سے محروم رکھا ہو۔ بلکہ ایک صریح آیتِ قرآنی ملتی ہے کہ: اور ہم نے موسیٰ پر دودھ پلانے والیوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کر دیا۔ اس قسم کی آیات کی روشنی میں حلیمہ اور دوسری عورتوں کی رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

مقدمہ

حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر تحریر کی گئی کتب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ سیرت نگاروں نے بہت سی بے بُنیاد اور وضع شدہ روایتوں کو اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آپؐ نے اپنی والدہ حضرت آمنہؑ بنت وہب کے علاوہ دیگر خواتین کا بھی دودھ پیا ہے اور جن اُس دور میں موحد ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا بلکہ اُن کے دفاع میں من گھڑت داستانیں رقم کی گئیں اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ایک ایسی عورت کا بھی نام رقم کیا جسے دشمن خدا و رسولؐ ابو لہب کی کنیز کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے اور والدہ رسول اکرم ﷺ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کے سر سے رضاعت پیغمبر ﷺ کی فضیلت کا تاج اُتار کر دوسری خواتین کے سر پر سجا دیا۔

کچھ لوگوں نے ان سیرت نگاروں کی واضح شدہ روایتوں پر عشقِ رسولؐ میں من و عن قبول کر لیا لیکن حق شناس لوگوں نے اس پر اشکال ظاہر کرتے ہوے اسے مسترد کر دیا اور یہ کہا کہ آپ ﷺ نے فقط اپنی والدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کا دودھ پیا تھا جس کی بناء پر دو نظریے سامنے آئے ہیں:۔

پہلا نظریہ : رسول اکرم ﷺ نے اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کے علاوہ دیگر خواتین کا بھی دودھ پیا تھا۔

دوسرا نظریہ : رسول اکرم ﷺ نے صرف اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کا دودھ پیا تھا۔ ہم نے اس مقالے میں اس اہم معاملہ کا تحقیقی جائزہ لیا ہے کیونکہ جس پیغمبر ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی حدیث قدسی موجود ہے:

لولاك لما خلقت الافلاك

ترجمہ: " اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں یہ افلاک خلق نہ کرتا۔" (1)

اُسی پیغمبر ﷺ کی رضاعت کے متعلق من گھڑت قصے کہانیاں گھڑی گئیں تاکہ ان کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کو اس فضیلت سے محروم کرکے دوسروں کو ان کے مد مقابل لایا جاسکے اور ان کی اہمیت کم کی جاسکے۔ پہلے نظریے سے تعلق رکھنے والی روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ ان راویوں میں

پہلا نام ابن سعد کا ہے۔ ابن سعد نے ثوبیہ کے حوالے سے یہ روایتیں نقل کی ہیں جنہیں ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

پہلی روایت ابن سعد نے اس طرح روایت نقل کی:

عن برة بنت أبي تجراة قالت أول من أرضع رسول الله صلى الله عليه و سلم ثويبة بلبن بن لها يقال له مسروح أياما قبل أن تقدم حليمة وكانت قد أرضعت قبله حمزة بن عبد المطلب وأرضعت بعده أبا سلمة بن عبد الأسد المخزومي۔ (2)

ترجمہ: "برّہ بنت تجراہ کہتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کو پہلے پہل ثوبیہ نے اپنے ایک لڑکے کے ساتھ دودھ پلایا جسے مسروح کہتے تھے۔ یہ واقعہ حلیمہ کی آمد سے قبل کا ہے۔ ثوبیہ نے اس پہلے حمزہ بن عبدالمطلب کو دودھ پلایا تھا، اور اس کے بعد ابو سلمہ بن عبدالاسد المخزومی کو دودھ پلایا۔"

دوسری روایت ابن سعد نے اس طرح بیان کی ہے:

عن بن عباس قال كانت ثويبة مولاة أبي لهب قد أرضعت رسول الله صلى الله عليه و سلم أياما قبل أن تقدم حليمة وأرضعت أبا سلمة بن عبد الأسد معه فكان أخاه من الرضاعة (3)

ترجمہ: "ابن عباس کہتے ہیں: ثوبیہ ابو لہب کی لونڈی تھی، حلیمہ کی آمد سے پیشتر رسول اللہ ﷺ کو اس نے چند روز دودھ پلایا تھا، اور آپ ہی کے ساتھ ابو سلمہ بن عبدالاسد کو بھی دودھ پلاتی تھی۔ لہٰذا ابو سلمہ آپؐ کے دودھ شریک بھائی تھے۔"

تیسری روایت ثوبیہ کی آزادی کے حوالے سے ابن سعد نے اس طرح نقل کی ہے:

عن عروة بن الزبير أن ثويبة كان أبولهب أعتقها۔۔۔ والتي تليها من الأصابع۔ (4)

ترجمہ: "عروہ بن الزبیر سے روایت ہے کہ ثوبیہ کو ابو لہب نے آزاد کر دیا تھا اور اسی وجہ سے اس نے رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ ابو لہب کے مرنے پر بعض لوگوں نے اس کو بدترین حالت میں خواب میں دیکھا تو پوچھا: کہو کیا گزری؟ ابو لہب نے کہا: تمہارے بعد ہمیں کوئی آسائش نہ ملی۔ البتہ میں ثوبیہ کو آزاد کرنے کے باعث پانی سے سیراب ہوا۔ ابو لہب نے اس پانی

کی مقدار کے بارے میں کہا تو انگوٹھے اور اس کے بعد انگلیوں کے پوروں کے درمیان اشارہ کیا تھا۔"

چوتھی روایت ابن سعد نے ثوبیہ کے بارے میں اس طرح نقل کی:

أخبرنا محمد بن عمر عن غير واحد من أهل العلم قالوا ـ ـ ـ قال رسول الله، صلى الله عليه وسلم: حمزة بن عبد المطلب أخي من الرضاعة. (5)

ترجمہ: "محمد بن عمر کئی اہل علم سے روایت کرتے ہیں جو کہتے تھے: رسول اللہ ﷺ مکہ میں ثوبیہ کی خبر گیری فرماتے تھے، خدیجۃ الکبریٰؑ بھی ثوبیہ کی بزرگ داشت کرتی تھیں۔ ثوبیہ اُن دنوں آزاد نہ تھیں، ان کی آزادی کی غرض سے خدیجۃ الکبریٰؑ نے ابو لہب سے درخواست کی کہ ان کے ہاتھ فروخت کردیں کہ آزاد کردی جائیں۔ مگر ابو لہب نے انکار کردیا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ میں ہجرت کی تو ابو لہب نے ثوبیہ کو آزاد کردیا۔ رسول اللہ ﷺ وہاں سے بھی ثوبیہ کو ہدیے بھجواتے تھے اور کپڑے دیتے تا آنکہ غزوہ خیبر سے واپس آتے وقت ۷ ہجری میں خبر ملی کہ ثوبیہ انتقال کر گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا؟ ثوبیہ کے بیٹے مسروح نے کیا کیا؟ کہا گیا: وہ تو ثوبیہ سے پہلے ہی مر چکے تھے، اس کی قرابت میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: حمزہ بن عبدالمطلب میرے رضاعی بھائی ہیں۔"

پانچویں روایت ابن سعد نے یہ نقل کی:

عن بن أبي مليكة قال كان... يوما وهو عند أمه حليمة (6)

ترجمہ: "ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں: حمزہ بن عبدالمطلبؑ رسول اللہ ﷺ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ آنحضرت ﷺ کو بھی اور انہیں بھی ایک عربیہ نے دودھ پلایا تھا۔ قبیلہ بنی بکر کے قبیلہ میں حمزہ کے دودھ پلانے کا انتظام تھا۔ رسول اللہ ﷺ ایک دن اپنی دودھ پلانے والی ماں حلیمہ کے پاس تھے کہ حمزہؑ کی والدہ نے آنحضرت ﷺ کو اپنا دودھ پلایا تھا۔"

چھٹی روایت ابن سعد نے اس طرح نقل کی:

سمعت أم سلمة زوج النبی، صلی اللہ علیہ وسلم، قالت: قیل له أین أنت یا رسول اللہ من ابنة حمزة؟ أو قیل له: ألا تخطب ابنة حمزة؟ قال: إن حمزة أخی من الرضاعة. (7)

ترجمہ: "اُم سلمہ زوج النبی ﷺ کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کی گئی کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ حمزہ کی لڑکی کی جانب سے کہا (بھولے ہوئے ہیں؟) یا آپ سے یہ کہا گیا حمزہ کی لڑکی کو آپ کیوں پیغام نہیں دیتے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: رضاعت کی حیثیت سے حمزہ میرے بھائی ہیں۔"

ساتویں روایت ابن سعد نے اس طرح نقل کی:

عن بن عباس أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم أرید علی ابنة حمزة فقال انها ابنة أخی من الرضاعة و انها لا تحل لی و انه یحرم من الرضاعة ما یحرم من النسب (8)

ترجمہ: "ابن عباس سے روایت ہے کہ حمزہؓ کی بیٹی کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خواہش کی گئی تو فرمایا! وہ مجھ پر حلال نہیں، وہ میرے رضاعی بھائی کی لڑکی ہے جو نسبت سے حرام وہ رضاعت سے بھی حرام ہے۔"

آٹھویں روایت ابن سعد نے اس طرح نقل کی:

عن عراك بن مالك أن زینب بنت أبی سلمة أخبرته أن أم حبیبة قالت لرسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم انا قد حدثنا أنك ناكح درة بنت أبی سلمة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیه و سلم أعلی أم سلمة وقال لو أنی لم أنكح أم سلمة ما حلت لی ان أباها أخی من الرضاعة (9)

ترجمہ: "عراک بن مالک سے روایت ہے کہ زینب بنت ابی سلمہ نے ان کی خبر دی کہ اُم حبیبہ (اُم المومنین) نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی، ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ درہ بنت ابی سلمہ سے نکاح کرنے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (کیا اُم سلمہ پر) پھر فرمایا! میں اگر اُم سلمہ سے نکاح نہ بھی کیے ہوتا تو بھی درہ ابی سلمہ میرے واسطے حلال نہ ہوتی۔ از روئے رضاعت اس کا باپ تو میرا بھائی ہے۔"

محمد ابن سعد کی کتاب طبقات الکبریٰ سے ہم نے ثوبیہ کی رضاعت کے حوالے تمام روایتوں کو نقل کیا ہے اورانتہائی باریک بینی کے ساتھ دیکھا ہے لیکن ہمیں صرف چار افراد کے نام ملے ہیں جو درج ذیل ہیں:۔ا۔ مسروح ۲۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۳۔ حمزہ بن عبدالمطلب ۴۔ ابو سلمہ ابن عبدالاسد

ابن سعد کی نقل کردہ روایت جسے ہم نے پانچویں روایت کے طور پر اوپر نقل کیا ہے اس روایت سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چچی یعنی حضرت حمزہ کی والدہ کا دودھ پیا اور اس بات کے لیے جو منظر کشی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن اپنی دودھ پلانے والی ماں حلیمہ کے پاس تھے کہ حمزہؑ کی والدہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا دودھ پلایا تھا۔ یہ کیسے مان لیا جائے کہ جو خاتون اپنے بیٹے کو دودھ پلاتی نہ تھیں وہ دوسرے کی اولاد کو کیوں دودھ پلائے گی؟

اس روایت میں بھی اشکال پایا جاتا ہے کیونکہ حلیمہ سعدیہ کے متعلق کہیں یہ بات نہیں ملتی کہ وہ مکہ میں رہتی تھیں بلکہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے قبیلے میں رہتی تھیں اور ہر چھ ماہ بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی والدہ سے ملانے کے لیے لاتی تھیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ حضرت حمزہ کی ماں انہیں دودھ پلائیں؟ رہا اس بات کا کہ یہ کہہ دیا جائے کہ ممکن ہے اُس وقت وہ وہاں موجود ہوں تو یہ بات اثبات کے لیے کافی نہیں کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت حمزہ میں عمر کا بہت بڑا فرق تھا جس کا بیان حضرت عبدالمطلب کی نذر کے حوالے سے بحث میں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ حضرت حمزہ کی والدہ کے پاس کب اور کیسے پہنچے تھے؟ اور یہ کہ حضرت حمزہ کے لیے اس روایت کے مطابق قبیلہ بنی بکر کی خواتین کا اہتمام تھا۔

اس قسم کی فرسودہ روایتوں کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ دیگر عورتوں سے متعلق روایتوں کو بھی ثابت کیا جاسکے جن میں عواتک کو کنواری لڑکیوں کی روایت بھی ہے۔ حالانکہ یہ معیوب بات ہوتی ہے کہ بلاوجہ عورتیں دوسری عورتوں کے بچوں کو لے انہیں اپنا دودھ پلانا شروع کردیں اور وہ رشتے جو نکاح کے لیے حلال ہوتے ہیں اُنہیں رضاعت کے ذریعے حرام کردیا جائے۔ ابن سعد کے بعد ہم دیار بکری کی کتاب تاریخ الخمیس سے ایک روایت نقل کرینگے جس میں اس نے تقریباً اُن تمام خواتین کے ناموں کا ذکر کیا ہے جن کے نام رضاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے لیے جاتے ہیں:

قال أهل السير أرضعت رسول الله صلّى الله عليه وسلم أمّه آمنة ثلاثة أيام... واحدة منهنّ عاتكة۔ (10)

ترجمہ: "اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے تین روز اپنی والدہ حضرت آمنہؑ بنت وہب کا دودھ پیا۔ یہ بھی بیان کیا کہ سات دیگر عورتیں جن میں ابو لہب کی کنیز ثوبیہ اسلمیہ تھی اس نے حلیمہ کے حوالے کیے جانے سے قبل دودھ پلایا تھا۔ پھر حلیمہ کا دودھ پیا۔ ابوالفتح سے یہ بھی روایت ملتی ہے کہ حضرت آمنہؑ، ثوبیہ اور حلیمہ کے علاوہ خولہ بنت مُنذر اور اُم ایمن کا دودھ پیا اور ابن قیم نے بیان کیا کہ تین عورتیں جن کا ایک ہی نام عاتکہ تھا ان کا بھی دودھ پیا۔"

دیار بکری کی نقل کردہ روایت کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے آٹھ عورتوں کا دودھ پیا جن میں سے ایک ان کی والدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ تھیں، ابو لہب کی کنیز ثوبیہ، حلیمہ سعدیہ، خولہ بنت مُنذر، اُم ایمن اور اور باقی تین خواتین کو عاتکہ کا نام دیا گیا ہے۔ آگے چل کر دیار بکری نے ان تین عاتکاؤں کے ناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان تمام خواتین میں سے پہلے ہم ان خواتین کے ناموں پر بحث کرینگے جنہیں تمام مورخین نے نظر انداز کیا ہے جیسے خولہ بنت مُنذر، اُم ایمن اور تین عاتکہ نامی لڑکیاں ہیں۔

پہلی خاتون خولہ بنت مُنذر کی رضاعت کی تردید کرتے ہوئے حلبی نے اپنے ہاں نقل کیا ہے کہ:

فی ذلك للوهم، وأن خولة بنت المنذر التی هی أم بردة إنما كانت مرضعة لولده إبراهيم. (11)

ترجمہ: " مولف کو وہم ہوگیا ہے کیونکہ خولہ بنت مُنذر جو اُم بردہ کہلاتی ہیں اُنہوں نے آنحضرت کو نہیں بلکہ اُن کے صاحب زادے ابراہیم کو دودھ پلایا تھا۔"

دوسری خاتون اُم ایمن ہیں حلبی نے ان کے حوالے سے بھی ایک روایت نقل کی ہے:۔

ذكره فی الخصائص الصغری رد بأنها حاضنته لا مرضعته وعلی تقدير صحته ينظر بدبن أی ولد لها كان فإنه لا يعرف لها ولد إلا أيمن وأسامة إلا أن يقال جاز أن لبنها در له صلى الله عليه وسلم من غير وجود ولد كما تقدم فی النسوة الأبكار۔ (12)

ترجمہ: "کتاب خصائص صغریٰ میں انکار کیا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی پیدائش کے وقت ان کی دائی تھیں۔ آپؐ کی دایہ یعنی دودھ پلانے والی نہیں ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے تو پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ ان کے اس وقت کون سا بچہ تھا جس کی وجہ سے ان کی چھاتیوں

میں دودھ تھا۔ کیونکہ ان کے صرف دو ہی بیٹے مشہور ہیں۔ ایک ایمن اور دسرے اسامہ اور یہ دونوں آنحضرت ﷺ کی ولادت کے بہت بعد میں پیدا ہوئے۔"

تیسرے ان تین عواتک خواتین کے حوالے سے بھی اشکال پایا جاتا ہے بقول حلبی کے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

أنا ابن العواتك من سليم۔(13)

ترجمہ: "میں بنو سلیم کی تین عاتکاؤں کا بیٹا ہوں۔"

اس روایت میں مہارت سے کام لیا گیا ہے اور اس وضع شدہ روایت کے سیاق و سباق کا جائزہ لیا جائے تو یہ روایت سمجھ سے بالاتر ہے اور اس کے نقائص ہی اس کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہیں کیونکہ حلبی نے یہ بیان نہیں کیا کہ آنحضرت بنو سلیم میں کیسے پہنچے؟ اور یہ لڑکیاں کہاں موجود تھیں؟ اور انہیں کیا حاجت پیش آئی تھی کہ وہ سرِ راہ اپنی چھاتیاں کھول کر ان کے منہ میں دیں۔ حلبی نے اُمِ ایمن کی رضاعت کے بارے میں یہ سوال اُٹھایا ہے کہ اُم ایمن نے اپنے کس بچے کی ولادت پر اس کے دودھ سے حضور اکرم ﷺ کو دودھ پلایا تھا کیونکہ اُم ایمن کے دونوں بیٹے تو رسول اکرم ﷺ سے بہت چھوٹے تھے اور آپ ﷺ کی ولادت کے بہت بعد میں پیدا ہوئے اور حلبی نے یہاں تک نقل کیا کہ اُم ایمن نے وہ دودھ حضور اکرم ﷺ کے بیٹے ابراہیم کو پلایا۔ یہ بات ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی لہٰذا اس پر اس مقام پر بحث نہیں کی جا سکتی۔

اس کے علاوہ عواتک کی کنواری لڑکیوں والی روایت کی تردید دیار بکری کی اس روایت سے ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے آنحضرت ﷺ کے خاندان میں تین ایسی خواتین گزری ہیں جن کے نام عاتکہ تھے۔ دیار بکری کی روایت درج ذیل ہے:

والعواتك ثلاث نسوة كنّ... وهي أمّ وهب أبي آمنة أمّ النبيّ صلّى الله عليه وسلم۔(14)

ترجمہ: "تینوں عواتک خواتین اُمہات النبی ﷺ ہیں جن میں سے پہلی عاتکہ بن ہلال بن فالخ بن ذکوان جو کہ عبد مناف بن قصیٰ کی والدہ تھیں، دوسری عاتکہ بن مُرہ بن ہلال بن فالخ جو کہ ہاشم بن عبد مناف کی والدہ تھیں اور تیسری عاتکہ بن اوقص بن مرہ بن ہلال جو اُم وہب یعنی حضرت آمنہ کے والدہ تھیں۔"

دیار بکری کی اس روایت کی رو سے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اگر تین عاتکاؤں کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا تو وہ اس حوالے سے درست ہو سکتا ہے کہ ان کے خاندان میں تین خواتین ایسی گزری ہیں کہ ان کے نام عاتکہ ہوں لیکن بنو سلیم کے قبیلے کی کنواری لڑکیوں والی بات کسی طور پر نہیں جچتی اور نہ ہی کوئی شخص اپنا حسب نسب چھوڑ کسی اور دوسرے خاندان سے اپنا تعلق جوڑتا ہے اور عرب کے قبائل میں اس بات کی بہت پاس داری کی جاتی تھی۔

یہ روایت صرف اس لیے گھڑی گئی ہے تاکہ بنو ہاشم کی خاندانی وجاہت کو نظر انداز کیا جاسکے۔ بہر حال بنو سلیم والی بات کسی طور پر قابل قبول نہیں اور حقیقت سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ان خواتین کے بعد اب صرف حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ ، ثوبیہ اور حلیمہ سعدیہ کے نام رہ جاتے ہیں لہٰذا پہلے ہم ثوبیہ پھر حلیمہ سعدیہ اور آخیر میں حضرت آمنہ کے حوالے سے قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں انبیاء کے حوالے سے بحث کرینگے۔

اب ہم یہاں پر معروف سیرت نگار حلبی کی کتاب سیرت الحلبیہ سے کچھ دیگر روایتوں کو بھی نقل کرتے ہیں جن کے ذریعہ بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کو رضاعی بھائی بنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے حالانکہ ان میں محاذآرائی رہتی تھی جس کے سبب حضرت عبدالمطلب ان لوگوں سے محتاط رہتے تھےاور ان کا مقابلہ کرنے کیلئے ہی اُنہوں نے دس بیٹوں کی پیدائش کے لیے منّت مانی تھی جس کا آگے ذکر کیا جائے گا۔

حلبی کی نقل کردہ روایتیں درج ذیل ہیں:۔ حلبی نے ثوبیہ کے مذہب کے حوالے سے ایک یہ روایت بھی نقل کی ہے جس سے اس کا غیر مُسلم ہونا ثابت ہوتا ہے:

أی وقد یدل علی عدم إسلام ثویبة وإبنها المذکور الذی هو مسروح... ولو کانا أسلما لهاجرا إلی المدینة۔ (15)

ترجمہ: "ایک روایت ایسی بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ثوبیہ اور ان کے بیٹے مسروح دونوں مسلمان نہیں ہوئے تھے کیونکہ رسول اللہ ﷺ ثوبیہ کے لیے (مدینہ منورہ) سے خرچہ وغیرہ بھیجا کرتے تھے۔ ثوبیہ مکہ میں تھی۔یہاں تک کہ ۷ہجری میں فتح خیبر کے بعد آپ ﷺ مدینہ منورہ واپس ہورہے تھے تو آپؐ کو ثوبیہ کی وفات کی خبر ملی۔آپؐ نے

پوچھا اس کا بیٹا مسروح کیا کرتا ہے؟ جواب دیا گیا کہ وہ ثوبیہ سے بھی پہلے مر چکا ہے۔ یعنی اگر دونوں مسلمان ہوگئے ہوتے تو (مکہ میں نہ ہوتے بلکہ ہجرت کرکے مدینہ پہنچ گئے ہوتے)۔"

ابن سعد، حلبی، دیار بکری کی روایتوں سے ملتی جلتی ایک روایت کو معروف مورخ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بطور نبی مبعوث ہونے کے بعد فرمایا:

فكان أول لبن شرب به بعد أمه لبن ثويبة مولاة أبي لهب... فقلت: بم هذا؟ فقال: بعتقي ثويبة لأنها أرضعتك. (16)

ترجمہ: "اپنی والدہ کے دودھ کے بعد آپؐ نے جو پہلا دودھ پیا وہ ابو لہب کی کنیز ثوبیہ کا تھا اور اس ثوبیہ نے حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالبؑ اور ابو سلمہ بن عبدالاسد مخزومی کو بھی دودھ پلایا تھا اور رسول اکرم ﷺ نے اللہ کی طرف سے نبی مبعوث کیے جانے کے بعد فرمایا! میں نے ابو لہب کو دوزخ میں پیاس پیاس پکارتے دیکھا تو اسے اس کے انگوٹھے کے گڑھے سے پانی پلایا جاتا ہے، میں نے پوچھا یہ کس وجہ سے ہے؟ اس نے کہا میرے ثوبیہ کو آزاد کرنے کی وجہ سے، کیونکہ اس نے آپؐ کو دودھ پلایا ہے۔"

حلبی کی اس روایت سے ثوبیہ کا دودھ پینے والے بچوں کی تعداد چار سے بڑھ کر پانچ ہو گئی ہے جس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی عورت کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ پانچ بچوں کو ایک زمانے میں یا دو سے لے کر پچیس سال تک اُس دودھ کو پلائے جو ایک بچے مُسروح کی ولادت پر جاری ہوا تھا کیونکہ حضرت حمزہ رسول اکرم ﷺ سے کم و بیش پچیس سال بڑے تھے جبکہ حضرت جعفر بن ابو طالب حضور اکرم ﷺ سے بیس سال چھوٹے تھے۔ اس سلسلے میں تفصیلاً بحث نیچے کی گئی ہے۔

حلبی کے علاوہ ربیعی کی کتاب عیون الاثر میں بھی ثوبیہ کے حوالے سے ایک روایت نقل کی گئی ہے۔ عیون الاثر میں رضاعت پیغمبر ﷺ کے حوالے سے کچھ اس طرح نقل کیا ہے اور حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کا نام بھی فراموش کر دیا گیا ہے:

أَوَّلُ مَنْ أَرْضَعَ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُوَيْبَةُ بِلَبَنِ ابْنٍ لَهَا يُقَالُ لَهُ: مَسْرُوحٌ أَيَّامًا قَبْلَ أَنْ تَقْدُمَ حَلِيمَةُ، وَكَانَتْ قَدْ أَرْضَعَتْ قَبْلَهُ حَمْزَةَ بْنَ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَبَعْدَهُ أَبَا سَلَمَةَ بْنَ عَبْدِ الأَسَدِ. (17)

ترجمہ: "سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے حلیمہ کی آمد سے قبل ثوبیہ کا دودھ پیا جو کہ اُس کے بیٹے مسروح کی پیدائش پر آیا تھا۔ اس سے پہلے حمزہ بن عبد المطلب اور پھر ابو سلمہ بن عبد الاسد نے ثوبیہ کا دودھ پیا تھا۔"

حلبی نے بنو اُمیہ اور بنو ہاشم کی دشمنی پر پردہ ڈالنے کے لیے ابو سفیان ابن حرب کی ولدیت بھی تبدیل کر ڈالی اور ابن حارث کا نام استعمال کرتے ہوئے ابو سفیان بن حرب کو رسول اکرم ﷺ کا دودھ شریک بھائی بناڈالا حالانکہ ابو سفیان رسول اکرم ﷺ کا چچازاد بھائی نہ تھا۔ حلبی نے اس کام کے لیے ایک واضح شدہ روایت کو سیرت شامی سے نقل کیا:

وكانت قد أرضعت قبله أبا سفيان أبن عمه صلى الله عليه وسلم الحارث (18)

ترجمہ: "ثوبیہ نے اس پہلے آنحضرت ﷺ کے چچا حارث کے بیٹے ابو سفیان کو بھی دودھ پلایا تھا۔"

وأرضعت ثويبة رضى الله تعالى عنها قبلهما عمه صلى الله عليه وسلم حمزة بن عبد المطلب، وكان أسنّ منه صلى الله عليه وسلم بسنتين، وقيل بأربع سنين. (19)

ترجمہ: "ثوبیہ نے آنحضرت ﷺ اور ابو سفیان کو دودھ پلانے سے پہلے آنحضرت ﷺ کے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب کو بھی دودھ پلایا تھا۔ حضرت حمزہ آنحضرت ﷺ سے دو سال بڑے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چار سال بڑے تھے۔"

حلبی نے اس کے اثبات میں ایک اور روایت نقل کی:

وأرضعت ثويبة رضى الله تعالى عنها قبلهما عمه صلى الله عليه وسلم حمزة بن عبد المطلب وكان أسن منه صلى الله عليه وسلم بسنتين وقيل بأربع سنين (20)

ترجمہ: "ثوبیہ نے آنحضرت ﷺ اور ابو سفیان کو دودھ پلانے سے پہلے آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب کو بھی دودھ پلایا تھا حضرت حمزہؓ آنحضرت ﷺ سے دو سال بڑے تھے اور یہ بھی کہا جاتا ہے چار سال بڑے تھے۔"

ابو سفیان کے رضاعی بھائی ہونے کے ناطے سے گھڑی جانے والی اس روایت میں ان عقل کے اندھوں نے شریعت کے اس قانون کو فراموش کر دیا ہے کہ جس میں رضاعی بھائی کی لڑکی بھی نکاح کے لیے

حرام ہو جاتی ہے اگر ایسا ہوتا تو رسول اکرم ﷺ ابو سفیان کی بیٹی حضرت اُم حبیبہ سے شادی نہ کرتے۔ یہ روایتیں قرآن و سنت کے منافی ہیں لیکن پھر بھی یہ سیرت نگار اپنے انہیں نقل کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سیرت نہیں بلکہ سیرت کی آڑ میں شانِ رسالت میں گستاخی کر رہے ہیں۔

اس کے بعد حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی رضاعت کے اثبات میں بھی کچھ اسی طرح اپنی مہارت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آپ سے کہا گیا کہ ان کی بیٹی سے نکاح کرلیں تو آپ نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ میرے رضاع بھائی کی لڑکی ہے اور اس کے اثبات میں احادیث کی کتب صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابن ماجہ اور ابن داؤد میں ایک روایت نقل کر دی لیکن وہ اس میں بھی ناکام رہے کیونکہ اُنہوں نے اُس بیٹی کا نام بیان نہیں کیا جس کے بارے میں یہ بات کہی گئی تھی اور نہ ہی تاریخ میں ایسی کسی بیٹی کا نام ملتا ہے جس کے متعلق یہ بات کہی گئی تھی۔

اس کے علاوہ بھی بہت سے دلائل ہیں جو حضرت حمزہ کے رضاعت کی تردید کرتے ہیں جو آگے آئیں گے۔ اب اگر حلبی کی نقل کردہ روایتوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو ثوبیہ کا دودھ پینے والے افراد کی تعداد پانچ تک جا پہنچی ہے اور کوئی بھی تاریخ ان پانچوں کی ایک زمانے میں شیر خواری ثابت نہیں کرتی لہٰذا ان روایتوں پر یقین نہیں کیا جاسکتا ہاں ان پر بحث کی جاسکتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ حضرت جعفر بن ابی طالب حضرت علیؑ سے بیس سال بڑے تھے اور آنحضرت ﷺ حضرت جعفر بن ابی طالب سے دس سال بڑے تھے جبکہ حضرت حمزہ کم و بیش پچیس سال بڑے تھے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ثوبیہ کے ہاں صرف ایک بیٹا مسروح پیدا ہوا تھا اور اس کا دودھ اتنے سال تک کیسے باقی رہا؟ کہ ان سب حضرات نے وہ دودھ پیا اور کیا اس کو اتنا دودھ اُترتا تھا کہ وہ ایک وقت میں پانچ افراد کو دودھ پلاتی تھی۔ جہاں تک ابو لہب کو جنت کا پانی پلانے کی باتیں ہیں وہ بھی قرآن کی رو سے غلط نظر آتی ہیں۔ ابو لہب ایک معروف دشمنِ خدا و رسول ﷺ تھا اور اس کی مذمت میں سورہ لہب نازل ہوا ہے۔ (21) ارشاد باری تعالیٰ ہے:

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (1) مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ (2) سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (3) وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (4) فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ (5)

ترجمہ: " ہلاکت میں جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ تباہ ہو جائے۔ نہ اس کا مال ہی اس کے کام آیا اور نہ اس کی کمائی۔ وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ جھلسے گا۔ اور اس کی بیوی بھی، ایندھن اٹھائے پھرنے والی۔ اس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی ہے۔"

اس کے علاوہ اللہ تعالی نے ایسے لوگوں کے لیے سورۃ اعراف واضح طور پر اعلان کیا: (22)

وَنَادَى أَصْحَابُ النَّارِ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ أَفِيضُوا عَلَيْنَا مِنَ الْمَاءِ أَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللهُ قَالُوا إِنَّ اللهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ (50)

ترجمہ: "اور جہنّم والے جنّت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ذرا ٹھنڈا پانی یا خدا نے جو رزق تمہیں دیا ہے اس میں سے ہمیں بھی پہنچاؤ تو وہ لوگ جواب دیں گے کہ ان چیزوں کو اللہ نے کافروں پر حرام کر دیا ہے۔"

مگر پھر بھی اموی حکومت اور عباسی حکومت کے نمک خوار مورخین نے ابو لہب کو جہنم میں جنت کا ایک گھونٹ ٹھنڈا پانی پلانے کی روایتیں وضع کرکے بیان کی ہیں جن کا مقصد صرف اور صرف رسول اکرم ﷺ کے والدین کے فضائل کو چھپانا مقصود ہے۔ جبکہ انہی مورخین نے حضرت ابو طالبؑ جنہوں نے نا صرف اپنی زندگی بلکہ اپنی پوری نسل کو حضور اکرم ﷺ کی اور ان کے لائے ہوے دین کی حفاظت کے لیے وقف کر دیا تھا اور پورا مقتل ان کی نسل کی قربانیوں سے بھرا پڑا ہے جس پر اصفہانی نے ایک کتاب مقاتل الطالبیین تحریر کی ہے۔ ان کے لیے انہی مورخین نے یہ روایت نقل کی کہ (نعوز باللہ) وہ جہنم کی آگ میں جل رہے ہیں۔

اس لیے ہم تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان روایتوں میں کوئی صداقت نہیں بلکہ یہ والدین رسول الثقلینؑ کی عظمت کے منکروں نے واضح کیں اور ان کا پرچار کیا تاکہ لوگوں کی نظر میں والدین رسول ﷺ کا کوئی مقام نہ رہے اور اپنے منتخب افراد کے فضائل گھڑنے میں آسانی ہوسکے یہ بات کسی طور پر ثابت نہیں ہوتی کہ حضور اکرم ﷺ نے ثوبیہ کا دودھ پیا یا حضرت حمزہؓ نے ان کا دودھ پیا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ابو سفیان نے اس کا دودھ پیا ہو جس کے باعث اس نے اپنی پوری زندگی رسول ﷺ اور آلِ رسول ﷺ کی مخالفت میں ابو لہب کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بسر کی۔ ان دلائل کی روشنی میں ابو لہب کی کنیز ثوبیہ کی رضاعت والی روایت کسی طور پر ثابت نہیں ہوتی اور غیر مقبول ہے۔

رہا سوال حضرت حمزہ کے رضاعی بھائی ہونے کا تو یہ بھی اشکال سے خالی نہیں ہے کیونکہ اس سلسلہ میں تاریخ میں حضرت عبدالمطلب کی دس بیٹوں والی نزر کا معاملہ بڑا مشہور ہے جسے یہاں دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔ سیرت کی کتب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت پر سب سے پہلے جس سیرت نگار نے قلم اُٹھایا وہ محمد بن اسحٰق بن یسار مطلبی المدنی ہے جو ۱۵۱ھ ہجری میں فوت ہوا۔ اسے حضور اکرم ﷺ کی سیرت نگاری کا بانی کہا جاتا ہے۔ ہم رضاعت پیغمبر ﷺ سے متعلق اُن کی روایتوں کو بھی نقل کرینگے تاکہ مذکورہ بالا روایتوں میں پایا جانے والا تضاد سامنے آجائے۔

پہلی روایت ابن اسحٰق کی کتاب المغازی سے نقل کرینگے جسے سیرت ابن اسحٰق بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں ابن اسحٰق نے رضاعت پیغمبر ﷺ سے متعلق صرف ایک روایت اس طرح نقل کی ہے۔

قال ابن إسحق: فدفع رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أمه، والتمس له الرضعاء، واسترضع له حليمة ابنة أبي ذؤيب۔ (23)

ترجمہ: "ابن اسحٰق نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلانے کے لیے بنی سعد بن بکر کی ایک عورت جس کا نام حلیمہ بنت ابی ذوئیب تھا مقرر کیا گیا۔"

اسی طرح ابن اسحٰق کے بعد ابن ہشام کا نام دوسرے درجے پر آتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس نے ابن اسحٰق کی تحریر کردہ سیرت النبی ﷺ کی کتاب میں کچھ کمی بیشی کرکے ایک نئی کتاب تالیف کی جو سیرت ابن ہشام کے نام مشہور ہوئی اسے بھی بعض لوگ سیرت ابن اسحٰق کا ہی نام دیتے ہیں۔ ابن ہشام نے رضاعت پیغمبر ﷺ کے متعلق روایت کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ اس طرح نقل کی ہے:

قال ابن إسحاق : فاسترضع له امرأة من بني سعد بن بكر ، يقال لها :حليمة ، ابنة أبي ذؤيب.(24)

ترجمہ: "ابن اسحٰق نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو دودھ پلانے کے لیے بنی سعد بن بکر کی ایک عورت جس کا نام حلیمہ بنت ابی ذوئب تھا مقرر کیا گیا۔"

ابن اسحٰق نے اپنی کتاب المغازی میں کسی بھی مقام پر ثوبیہ نامی کسی عورت کا ذکر نہیں کیا اور اسی طرح ابن ہشام نے بھی اپنی تالیف کردہ سیرت ابن ہشام نامی کتاب میں ثوبیہ نامی کسی عورت کا نام بیان نہیں

کیا۔ بعد میں آنے والے مؤرخین نے نہ جانے اس عورت کا نام کہاں سے لیا ہے وہ اس کی اسناد بیان کرنے میں ناکام رہے۔

سیرت کی کتب میں اور تواریخ اسلامی کی تمام کتب میں حضرت عبدالمطلب کی ایک منت کا بھی ذکر ہوتا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ نے آپ زم زم کا کنواں کھودا اُس کا پانی لوگوں کے پینے کے لیے دوبارہ بحال کیا تو اس کی کھدائی کے دوران طلائی ہرن نکلے تھے جسے دیکھ کر مخالف گروہ جنگ کے لیے آمادہ دکھائی دیتا تھا جس پر حضرت عبدالمطلب نے اپنے حامیوں کی تعداد کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے سامنے جا کر منت مانی اور یہ نیت ظاہر کی کہ اگر اللہ تعالیٰ اُنہیں دس فرزند عطاء کرے تاکہ وہ دشمن کے مقابلے کے قابل ہو جائیں تو وہ اپنے ایک فرزند کو اس کی راہ میں خانہ کعبہ کے سامنے قربان کریں گے۔

جب حضرت عبدالمطلب کے ہاں دس فرزندوں کی پیدائش ہو گئی اور وہ جوان ہوئے تو اُنہوں نے اپنی منت پوری کرنے کا عزم کیا جسے پورا کرنے کے لیے اُن کے تمام بیٹوں نے اپنے اپنے نام دیے لیکن آپ نے قرعہ نکال کر اس نذر کو پورا کرنے کا اعلان کیا اور اس مقصد سے آپ خانہ کعبہ کے سامنے گئے۔ اس واقعہ کو یہاں ہم نقل کر رہے ہیں:

فعند ذلك نذر لئن ولد له عشرة لينحرن أحدهم فلما ولد له عشرة وأراد ذبح عبد الله-(25)

ترجمہ: "حضرت عبدالمطلب نے منت مانی تھی کہ اگر ان کے ہاں دس لڑکے پیدا ہوئے تو وہ ایک لڑکا قربان کریں گے۔"

اور ان بیٹوں کے نام بھی ابن ہشام نے نقل کیے ہیں جو درج ذیل ہیں:

الحرث والزبير وحجل وضرار والمقوم وأبولهب والعباس وحمزة وأبو طالب وعبدالله(26)

ترجمہ: "حارث، زبیر، غیداق، ضرار، مقوم، ابولہب، ابو طالب، حمزہ، عباس اور عبداللہ اور یہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ نذر کے وقت سب سے چھوٹے تھے۔"

اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی بیان کیا ہے کہ ان کے ایک بھائی جن کا نام عباس تھا اُنہوں نے حضرت عبداللہ کو ذبح ہونے سے بچایا تھا اور وہ اس کوشش میں زخمی ہو گئے تھے:

أن العباس بن عبد المطلب اجترہ من تحت رجل أبیہ حتی خدش وجہ عبد اللہ خدشا ، لم یزل فی وجھہ حتی مات۔ (27)

ترجمہ: " حضرت عبداللہ کو ان کے بھائی عباس نے اپنے والد کی چھری سے بچا کر گھسیٹ لیا تھا جس سے ان کے چہرے پر خراش آئی جس کا نشان ان کی وفات تک باقی رہا۔ "

ثوبیہ کے بارے میں منابع کتب میں ملتا ہے کہ انہی ایام میں ثوبیہ کے ہاں مسروح نامی بیٹا پیدا ہوا تھا جو ثوبیہ کی زندگی میں ہی وفات پاگیا تھا اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جب ثوبیہ حضور اکرم ﷺ کو دودھ پلانے کے لیے آئی تو اس وقت اس کا بیٹا مسروح بھی اس کے ساتھ تھا۔ پھر اس نے رسول اکرم ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کو دودھ پلایا اور ساتھ ہی ابو سلمہ بن عبداللہ بن عبدالاسد مخزومی نے بھی اس کا دودھ پیا۔ (28)

اس روایت میں حلبی نے ایک ساتھ چار بچوں کو دودھ پلوادیا جو کہ کسی بھی عورت کے لیے ممکن نہیں ہوتا ہے۔ بہر حال حلبی کے اس بیان کو مسترد ہی کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے ہاں اس قسم کی روایتوں کی بھرمار ہے۔

حلبی اور یعقوبی اور دیگر سیرت نگاروں کی روایتوں کے مطابق حضرت حمزہؓ اور ابو سلمہ بھی آپؐ کے رضاعی بھائی تھے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ رسول اکرم ﷺ کے ہم عمر تھے اس لیے ضروری ہے کہ یہاں چند باتوں کا ذکر کیا جائے:

الف) مورخین جب حضرت عبدالمطلب کی دس بیٹوں والی نذر کا ذکر کرتے ہیں تو وہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہؓ تمام بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہؓ کو ان کے بھائی عباس نے اپنے والد کی چھری سے بچا کر گھسیٹ لیا تھا جس سے ان کے چہرے پر خراش آئی جس کا نشان ان کی وفات تک باقی رہا۔ لیکن جب ثوبیہ کی رضاعت کی بات کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ عباس کے بڑے بھائی حضرت حمزہؓ حضرت عبداللہ علیہ السلام کے بیٹے رسول اکرم ﷺ کے ہم عمر تھے کیونکہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اکٹھے ثوبیہ کا دودھ پیا تھا اس لیے اگر عمر میں فاصلہ ہوا بھی تو ایک دو سال کا ہوگا۔

ایک طرف تو حضرت حمزہؓ رسول اکرم ﷺ کے والد حضرت عبداللہ علیہ السلام سے بڑے بیان کیے جاتے ہیں تو دوسری طرف پچیس سال کے فرق سے حضرت عبداللہ علیہ السلام کے بیٹے رسول اکرم ﷺ کے ہم عمر ہو جاتے ہیں دوسرے معنی میں اپنے چھوٹے بھائی سے تو بڑے ہیں لیکن اسی بھائی کے بیٹے کے ہم عمر ہیں۔ مورخین کی اس غلطی کو نبھانے کے لیے حلبی نے خوب تانے بانے بُننے کی کوشش کی ہے جو اشکال سے خالی نہیں ہے اس لیے ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔

ب) مورخین نے مسروح اور اس کے باپ کے متعلق کچھ بیان نہیں کیا کہ مسروح کس کا بیٹا ہے؟ حالانکہ عرب تو حسب اور نسب کا بہت خیال رکھتے تھے اور یہ ممکن نہیں ہے کہ مورخین کو مسروح کا نسب کا معلوم نہ ہو۔ اگر مسروح ابو لہب کا بیٹا تھا تو پھر مورخین نے اس کی صراحت کے ساتھ وضاحت کیوں نہیں کی۔

ج) مؤرخین میں ثوبیہ کا دودھ پینے والوں کے ناموں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور مختلف شخصیات کے نام لیے جاتے ہیں۔ بعض کتب میں رسول اکرم ﷺ ، حضرت حمزہؓ اور ابو سلمہ کے علاوہ ابو سفیان کے نام بھی بیان کیے گیے ہیں۔ ان باتوں سے ذہن میں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا عربوں میں کسی عورت کے لیے یہ ممکن تھا؟ یا یہ کوئی رسم تھی کہ وہ ایک ساتھ کئی بچوں کو دودھ پلائے؟ اگر ایسا تھا تو تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کیا ثوبیہ اتنی قسمت کی دھنی تھی کہ اُسے تاریخ کی کئی اہم شخصیات کو ایک ہی وقت میں دودھ پلانے کا اتفاق ہوا؟ یا پیشہ ور حدیث سازوں نے مذکورہ شخصیات کی قابل ذکر صفات اور دوسرے فضائل ثوبیہ کے ہی مرہون منت قرار دینے کی کوشش کی ہے؟

مگر حیرت اس بات کی ہے کہ ان مورخین کو اتنا بھی شعور نہ تھا کہ اپنے ہی وضع کردہ اصول اور بیان کردہ فرسودہ رسوم کو مد نظر رکھتے ہوئے روایتیں گھڑتے۔ ایک طرف تو یہ بات بڑے زور و شور سے بیان کرتے ہیں کہ عربوں کی عادت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بادیہ نشین یا صحرائی عورتوں کو دودھ پلانے کے لیے دے دیتے تھے تاکہ وہ شہر مکہ سے دور لے جا کر کھلی فضاء میں ان کی رضاعت اور پرورش کا کام انجام دین لیکن ثوبیہ کے معاملے میں اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا اور یہ بھی نہ سوچا کہ وہ مکہ شہر کی باسی تھی اور ابو لہب کے گھر میں رہتی تھی، نہ تو وہ بادیہ نشین تھی نہ ہی صحرا میں رہنے والی تھی۔

د) جیسا کہ اوپر نقل کیا جاچکا ہے کہ ملیکۃ العرب اور مکہ کی سب سے امیر خاتون اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ نے ابو لہب کو ثوبیہ کی منہ مانگی قیمت دینے کی پیشکش کی تھی کہ وہ قیمت لے کر اسے آزاد کردے لیکن ابو لہب نے ان کی پیشکش کو قبول نہ کیا اور صراحت کے ساتھ انکار کر دیا تھا۔ حیرت اس بات کی ہے کہ یہ بات حلبی کی سمجھ میں نہ آئی اور حلبی نے پھر بھی بیان کیا کہ ابو لہب نے ثوبیہ کو رسول اکرم ﷺ کی ولادت کی خبر دینے پر آزاد کیا تھا۔

اس کے برعکس ہمیں دیار بکری کے ہاں ایک دوسری روایت ملتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ابو لہب نے اسے ہجرت کے بعد اپنی رضا و رغبت سے آزاد کیا تھا۔(29) اس تضاد کی گتھی کو سلجھانے کے لیے حلبی نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر بیان کیا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ابو لہب نے ثوبیہ کو اسی وقت آزاد کر دیا ہو لیکن اس کی آزادی کو مخفی رکھا ہو اور اس کو فروخت کرنے سے انکار کا بھی یہی سبب ہو کہ وہ آزاد ہو گئی تھی اور کسی آزاد عورت کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی اور اس کی آزادی کا اظہار رسول اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد کیا ہے۔

حلبی کے الفاظ اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ یہ روایتیں صحیح نہیں ہیں کیونکہ ابو لہب کے ثوبیہ کو آزاد کرنے کے بعد اسے ابو لہب کو اپنے پاس رکھنے کا کوئی جواز نہیں بنتا اور حلبی یہ بتانے میں ناکام رہے کہ ابو لہب نے ثوبیہ کو بیالیس سال کے طویل عرصے تک اپنے پاس کیوں رکھا؟ اور ثوبیہ خود آزاد ہونے کے بعد بھی اُس کے پاس اتنا عرصہ کیوں رہی؟ کیا اُسے اپنی آزادی پسند نہ آئی تھی یا اسے آزادی کی کوئی خوشی نہ ہوئی یا پھر وہ دین اسلام کے ذمرے میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی یا پھر اُس کے پاس اپنے گزر اوقات کے لیے اسباب نہ تھا۔ اگر ثوبیہ کے مال و اسباب نہیں تھا تو اُس نے اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ کی سنہری پیشکش کا فائدہ کیوں نہ اُٹھایا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سیرت النبیؐ لکھنے والے مورخین کو دشمن خدا و رسول ﷺ ابو لہب کی وکالت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں جتنی بھی روایتیں ملتی ہیں، ان روایتوں کی اسناد میں موسیٰ شیبہ نامی شخص کا ذکر آیا ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ اُس کی روایتیں جھوٹی ہوتی ہیں جبکہ دوسری راویہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب بن مالک ہے جس کے متعلق کہا

جاتا ہے کہ یہ نامعلوم عورت ہے اور اس کا ذکر فقط اسی روایت میں ہوا ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ (بخاری کتاب النکاح کے باب میں (30) مسلم کتاب الرضاع۔۔۔۔۔۔۔۔3658۔

وَحَدَّثَنَا هَارُونُ بْنُ سَعِيدٍ الأَيْلِيُّ وَأَحْمَدُ بْنُ عِيسَى قَالاَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ أَخْبَرَنِي مَخْرَمَةُ بْنُ بُكَيْرٍ عَنْ أَبِيهِ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ بْنَ مُسْلِمٍ يَقُولُ سَمِعْتُ مُحَمَّدَ بْنَ مُسْلِمٍ يَقُولُ سَمِعْتُ حُمَيْدَ بْنَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ يَقُولُ سَمِعْتُ أُمَّ سَلَمَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ـ صلى الله عليه وسلم ـ تَقُولُ قِيلَ لِرَسُولِ اللهِ ـ صلى الله عليه وسلم ـ أَيْنَ أَنْتَ يَا رَسُولَ اللهِ عَنِ ابْنَةِ حَمْزَةَ. أَوْ قِيلَ أَلاَ تَخْطُبُ بِنْتَ حَمْزَةَ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ قَالَ «إِنَّ حَمْزَةَ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ». (31)

ابوداود کی کتاب النکاح۔۔۔۔2058۔

حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ النُّفَيْلِيُّ حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ أُمِّ سَلَمَةَ عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ أَنَّ أُمَّ حَبِيبَةَ قَالَتْ يَا رَسُولَ اللهِ هَلْ لَكَ فِي أُخْتِي قَالَ « فَأَفْعَلُ مَاذَا ». قَالَتْ فَتَنْكِحُهَا... إِنَّهَا ابْنَةُ أَخِي مِنَ الرَّضَاعَةِ أَرْضَعَتْنِي وَأَبَاهَا ثُوَيْبَةُ فَلاَ تَعْرِضْنَ عَلَيَّ بَنَاتِكُنَّ وَلاَ أَخَوَاتِكُنَّ». (32)

اور سنن ابن ماجہ کی کتاب النکاح۔۔۔۔1939۔

حدثنا محمد بن رمح . أبأنا الليث بن سعد عن يزيد بن أبي حبيب عن ابن شهاب عن عروة بن الزبير أن زينب بنت أبي سلمة حدثته أن أم حبيبة حدثتها أنها : ـ قالت لرسول الله صلى الله عليه و سلم انكح أختي عزة . قال رسول الله صلى الله عليه و سلم (أتحبين ذلك ؟) قالت نعم . يا رسول الله قلست لك بمخلية . وأحق من شركني في خير أختي . قال رسول الله صلى الله عليه و سلم (فإن ذلك لا يحل لي) قالت فإنا نتحدث أنك تريد أن تنكح درة بنت أبي سلمة . فقال (بنت أم سلمة ؟) قالت نعم . قال رسول الله صلى الله عليه و سلم (فإنها لو لم تكن ربيبتي في حجري ما حلت لي . إنها لابنة أخي من الرضاعة . أرضعتني وأباها ثويبه فلا تعرضن علي أخواتكن ولا بناتكن (33)

کتب احادیث میں ملنے والی وہ تمام احادیث جن میں ثوبیہ کا نام آیا ہے، یہ سب احادیث اسی پہلی حدیث کی بنیاد پر بیان کی گئی ہیں جو کہ اشکال سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہیں اسی لیے انہیں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ مگر کیا کہنا ان ضمیر فروش مورخین کا جنہوں نے اموی اور عباسی حکمرانوں سے مالی منافعت حاصل کرنے ان کی آشیر باد لینے کی غرض سے انہوں نے والدین رسول الثقلینؑ پر حرف ذنی سے گریز نہ کیا۔

حلیمہ سعدیہ کے بارے میں پہلی روایت ابن سعد کی ہے جو اس طرح نقل ہوئی ہے:

أخبرنا محمد بن عمر بن واقد الأسلمی، أخبرنا زکریا بن یحیی بن یزید السعدی عن أبیه قال: قدم مکة عشر نسوة من بنی سعد بن بکر یطلبن الرضاع، فأصبن الرضاع کلهن الا حلیمة بنت عبد الله بن الحارث بن شجنة بن جابر بن رزام بن ناصرة بن فصیة بن نصر بن سعد ابن بکر بن هوازن بن منصور بن عکرمة بن خصفة بن قیس بن عیلان ابن مضر (34)

ترجمہ: "یحییٰ بن یزید السعدی کہتے ہی: مکہ میں بچوں کو دودھ پلانے کی غرض سے قبیلہ بنی سعد بن بکر کی دس عورتیں آئیں تو ابس بچے مل گئے مگر ایک حلیمہ بنت عبد اللہ بن الحارث بن شجنۃ بن جابر بن رزام بن ناصرۃ بن فصیۃ بن نصر بن سعد ابن بکر بن ہوازن بن منصور بن عکرۃ بن خصفۃ بن قیس بن عیلان ابن مضر باقی رہیں جنہیں کوئی بچہ نہ ملا۔"

دوسری روایت ابن سعد کی اس طرح بیان ہوئی ہے:

فعرض علیها رسول الله، صلی الله علیه وسلم، فجعلت تقول: ... ، فشرب رسول الله، صلی الله علیه وسلم، حتی روی، وشرب أخوه ولقد کانا اخوه لاینام من الغرث (35)

ترجمہ: "جب آنحضرت ﷺ کی رضاعت ان عورتوں کو پیش کی گئی تو کہنے لگیں: (یتیم بے مال و منال) ان کی ماں کیا کرلیں گی؟ قبیلہ کی تمام عورتیں حلیمہ کو چھوڑ کر چلی گئیں تو حلیمہ نے اپنے شوہر سے کہا: تیری کیا رائے ہے؟ میری ساتھ والیاں تو چلی گئیں اور مکہ میں دودھ پلانے کے لیے بجُز اس یتیم بچے کے کوئی نہیں، اگر ہم اسے لے لیں تو کیا؟ کیونکہ مجھے یہ بُرا معلوم ہوتا ہے کہ بے کچھ لیے واپس گھر جائیں۔ شوہر نے جواب دیا: اسے لے لیں، شاید اس میں ہمارے لیے کوئی بہتری ہو۔ حلیمہ رسول اللہ ﷺ کی والدہ کے پاس آئیں۔ان سے

لے کر آنحضرت ﷺ کو اپنی آغوش میں لیا تو دونوں چھاتیاں اس قدر بھر آئیں کہ اب ان سے دودھ ٹپکنے لگا۔ رسول اللہ ﷺ نے آسودہ ہوکے پیا اور آپ ﷺ کے دودھ شریک نے بھی پیا جس کی پہلے یہ حالت تھی کہ بھوک کے مارے سوتا نہ تھا۔"

وقالت أمه: يا ظئر سلى عن ابنك فإنه سيكون له شأن،

آنحضرت ﷺ کی والدہ نے حلیمہ سے کہا: مہربان اور شریف دائی۔ میرے بچے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی جانب سے خبر دار رہنا کیونکہ عنقریب اس کی ایک خاص شان ہو گی۔

وأخبرتها ما رأت وما قيل لها فيه حين ولدته، وقالت: قيل لي ثلاث ليال: استرضعي ابنك في بني سعد بن بكر، ثم في آل أبي ذؤيب، قالت حليمة: فإن أبا هذا الغلام الذي في حجري أبو ذؤيب، وهو زوجي،

ترجمہ: "آمنہ نے آنحضرت ﷺ کی ولادت کے وقت جو کچھ دیکھا تھا اور اس مولود کی نسبت جو ان سے کہا گیا تھا، حلیمہ کو سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی کہا: مجھ سے (متواتر) تین شب کہا گیا کہ اپنے بچے کو اوّلا قبیلہ بن سعد بن بکر میں، پھر آلِ ابو ذویب میں دودھ پلوانا۔ حلیمہ نے کہا: یہ بچہ جو میری گود میں ہے اسی کا باپ ابو ذویب میرا شوہر ہے۔"

فطابت نفس حليمة وسرت بكل ما سمعت، ثم خرجت به إلى منزلها، فحدجوا أتانهم، فركبتها حليمة وحملت رسول الله، صلى الله عليه وسلم، بين يديها وركب الحارث شارفهم فطلعا على صواحبها بوادي السرر، وهن مرتعات وهما يتواهقان،

ترجمہ: "غرض کہ حلیمہ کی طبیعت خوش ہو گئی اور ان سب باتوں کو سن کے خوشی خوشی آنحضرت ﷺ کو لیے ہوئے اپنی فرودگاہ پہنچی۔ گدھی پر اسباب و کجاوہ رکھا اور حلیمہ رسول اللہ ﷺ اپنے آگے لیے ہوئے بیٹھ گئیں۔ ان کے آگے حارث بیٹھے۔ چلتے چلتے وادیٔ السّرر میں پہنچے ساتھ والیوں سے ملاقات ہوئی جو شاداں و مسرور تھیں اور حلیمہ و حارث کوشش کر رہے تھے کہ ان کے برابر آجائیں۔"

فقلن: يا حليمة ما صنعت؟ فقالت: أخذت والله خير مولود رأيته قط وأعظمهم بركة،قال النسوة: أهو بن عبد المطلب؟ قالت: نعم! قالت: فما رحلنا من منزلنا ذلك حتى رأيت الحسد من بعض نسائنا.

ترجمہ: "حلیمہ سے ان عورتوں نے پوچھا کیا کیا؟ جواب دیا خدا کی قسم جتنے بچے میں نے دیکھے ان سب میں بہترین مولود بزرگ ترین برکت والے کو میں نے لیا ہے۔ عورتوں نے کہا: کیا وہ عبدالمطلب کا لڑکا؟ حلیمہ نے کہا: ہاں۔ حلیمہ کہتی ہیں: ہم نے اس منزل سے کوچ بھی نہ کیا تھا کہ دیکھا بعض عورتوں میں حسد نمایاں ہے۔"

قال: أخبرنا محمد بن عمر قال: وذكر بعض الناس أن حليمة لما خرجت برسول الله، صلى الله عليه وسلم، إلى بلادها قالت آمنة بنت وهب:

ترجمہ: "محمد بن عمر کہتے ہیں: بعض لوگوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کو حلیمہ اپنے گھر لے چلیں تو آمنہ بنت وہب نے کہا:

أعيذه بالله ذي الجلال... من شر ما مر على الجبال

حتى أراه حامل الحلال... ويفعل العرف إلى الموال

ترجمہ: "میں اس وقت تک کے لیے اس کو خدا کی پناہ میں دیتی ہوں کہ اسے امر حلال کا حامل اور غلاموں کے ساتھ نیکی کرتے دیکھ لوں۔"

وغيرهم من حشوة الرجال...

ترجمہ: "اور صرف غلاموں ہی کے ساتھ نہیں بلکہ یہ بھی دیکھوں کہ ان کے علاوہ دوسرے ادنی درجے کے لوگوں کے ساتھ بھی نیکیاں کر رہا ہے۔"

حلیمہ سعدیہ کے حوالے سے جو باتیں سامنے آئی ہیں وہ یہ ہے کہ جب اُن پر آپ ﷺ کی رضاعت پیش کی گئی تو اُنہوں نے آپ ﷺ کی رضاعت کو یتیم ہونے کے سبب قبول کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کی اور جب کوئی بچہ نہ ملا تو شوہر سے مشورہ کرکے اپنے خاندان کی بھوک افلاس مٹانے کی غرض سے مجبوراً قبول کرلیا۔ اگر ایسا ہے تو روایت اشکال سے خالی نہیں ہے کیونکہ آپ ﷺ ولادت کے وقت نہ تو یتیم تھے اور نہ ہی لاوارث تھے کہ ان کے خاندان کی بابت کوئی ایسی بات کسی کے دل میں آسکتی تھی۔

حضرت عبدالمطلب رئیسِ مکہ تھے اور حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کسی سے کم نہ تھیں۔ پھر یہ کہ حضرت عبداللہ علیہ السلام نے آپ کی ولادت کے کئی ماہ بعد اس دارِ فانی سے کوچ کیا تھا جسے کتاب صفۃ الصفوۃ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وقد روی عن عوانة بن الحکم أن عبد الله توفی بعد ما أتی علی رسول الله صلی الله علیه وسلم ثمانیة وعشرون شهراً، وقیل سبعة أشهر. (36)

ترجمہ: "عوانہ بن حکم سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے اٹھائیس ماہ بعد اور بعض کے نزدیک سات ماہ بعد دنیا کو الوداع کیا۔"

اگر حلیمہ سعدیہ، تین کنواری لڑکیوں جن کو عاتکہ کا نام دیا گیا ان سے منسوب معجزات بیان کرکے کام چلانا ہے اور ان پر یقین کیا جائے تو پھر شیخ کلینی کی نقل کردہ اس روایت کو بھی درست ماننا پڑے گا اور یقین کرنا پڑے گا جو اُنھوں نے آپ ﷺ کے چچا حضرت ابو طالبؑ کے متعلق جنھوں نے اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے وقف کردی تھی اور انہیں آپ ﷺ کا حامی و ناصر بنایا اور ہمیشہ اس پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ کلینی کی روایت درج ذیل ہے:

محمد بن یحیی، عن سعد بن عبد الله، عن إبراهیم بن محمد الثقفی، عن علی بن المعلی، عن اخیه محمد، عن درست بن ابی منصور، عن علی بن ابی حمزة، عن ابی بصیر، عن ابی عبد الله علیه السلام قال: لما ولد النبی صلی الله علیه واله مکث ایاما لیس له لبن، فالقاه ابو طالب علی ثدی نفسه، فانزل الله فیه لبنا فرضع منه علی حلیمة السعدیة فدفعه إلیها. (37)

جب رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو چند دن تک ان کی والدہ کے دودھ نہ اُترا۔ ابو طالب نے ان کو اپنی چھاتی سے لگایا۔ خدا نے دودھ اتار دیا اور رسول اکرم ﷺ کی رضاعت اس سے ہوئی، پھر ابو طالب نے ان کو حلیمہ سعدیہ کے سپرد کیا۔ شیخ کلینی نے بھی مذکورہ روایت کو ایک معجزہ کے طور پر بیان کیا ہے اور اس روایت میں حضرت ابوطالبؑ اور حلیمہ سعدیہ کا نام بیان کیا ہے۔

اب رہا سوال حلیمہ سعدیہ کی رضاعت کا تو اس پر بھی اشکال پایا جاتا ہے کیونکہ اللہ تعالی جو کہ ان اللہ علی کل شی قدیر (اللہ تعالیٰ ہر ے شے پر قدرت رکھتا ہے) آپ ﷺ اس کی محبوب شخصیت ہونے کے ساتھ ہی طٰہٰ اور یٰسین کے لقب کے بھی مصداق ہیں وہ اُنہیں ان کی ماں کے دودھ سے محروم رکھے جس

کے رحم کو خود رسول اکرم ﷺ نے طیب و طاہر قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ عام لوگوں کے لیے حکم صادر کر رہا ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔ (38)

ترجمہ: "مائیں اپنی اولاد کو دو برس کامل دودھ پلائیں گی جو رضاعت کو پورا کرنا چاہے۔"

اس آیت کی موجودگی میں سمجھ میں نہیں آتا کہ سیرت نگاروں کو کونسی مجبوری نظر آئی کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے محبوب پیغمبر ﷺ کو ان کی ماں کا دودھ پینے سے محروم رکھا اور انہیں دیگر خواتین کا دودھ پینے کی روایت بیان کر ڈالی۔ یہی وہ سوال ہے جس نے لاکھوں ذہنوں میں جنم لیا ہے اور ہم نے اس موضوع پر اس مقالے میں بحث کی ہے تاکہ حق کے متلاشی افراد اس پر غور کرکے اپنی صحیح سمت کا تعین کریں کہ آیا ہم واقعی سیرت پیغمبر ﷺ بیان کر رہے ہیں یا پھر سیرت پیغمبر ﷺ کی آڑ میں ان پر حرف زنی کر رہے ہیں؟

حضرت آمنہؑ کی رضاعت کے حوالے سے بات کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ کی رضاعت کی مدت تک حضرت آمنہؑ بقید حیات تھیں جس کے بارے میں مواهب اللدينه میں یہ روایت ملتی ہے:

ولما بلغ۔ صلى الله عليه وسلم۔ أربع سنين۔ وقيل خمسا، وقيل ستّا، وقيل سبعا، وقيل تسعا۔ ماتت أمه بالأبواء۔ (39)

ترجمہ: "جب آپ ﷺ چھ سال کے سن کو پہنچے، ایک قول ہے پانچ سال، ایک قول ہے چھ سال، ایک قول سات سال اور ایک قول کے مطابق ۹ سال تو آپؐ کی والدہ کا انتقال ربوہ میں ہوا۔"

جبکہ تاریخ خمیس میں اس روایت کو اس طرح نقل کیا گیا ہے:

وفى السنة السادسة من مولده صلّى الله عليه وسلم وفاة آمنة فى المواهب اللدنية لما بلغ صلّى الله عليه وسلم ست سنين وقيل أربع وقيل خمس وقيل سبع وقيل تسع وقيل اثنتى عشرة سنة (40)

ترجمہ: "رسول اکرم ﷺ کی عمر چھ سال تھی جب حضرت آمنہؑ کا انتقال ہوا، مواھب اللدینہ میں بیان کیا گیا ہے کہ چھ سال، چار سال، پانچ سال، سات سال اور ایک قول کے مطابق بارہ سال تھی اور ابن سعد نے چھ سال بیان کی ہے۔" (41)

ان روایتوں کی موجودگی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے لے کر عہد رضاعتِ پیغمبر ﷺ تک آپؐ کی والدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ بقیدِ حیات تھیں جس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ مورخین نے حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کی رضاعت کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ نے آپ ﷺ کو کل نو (۹) دن دودھ پلایا جسے حلبی نے اس طرح نقل کیا ہے:

قال: وجاء أن أمه أرضعته صلى الله عليه وسلم تسعة أيام. (42)

اس روایت کو صاحب الدرد وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کل تین دن دودھ پلایا اور بعض سات دن بتلاتے ہیں۔ ان اقوال کو صاحبان سیر سے صاحب تاریخ خمیس نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

أرضعت رسول الله صلّى الله عليه وسلم أمّه آمنة ثلاثة أيام وقيل سبعة۔ (43)

اب قرآن مجید اور تاریخ انبیاء کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک تمام پیغمبروں کو ان کی ماؤں کا دودھ پلوایا اور جہاں یہ دودھ مَیسّر نہ ہوا تو وہاں اس نے اپنی قدرت کاملہ سے ان بچوں کے انگوٹھوں میں سے دودھ جاری کر دیا۔ اس حوالے سے حلبی نے اپنے ہاں روایت نقل کی:

فعن ابن عباس رضى الله تعالى عنهما قال: كان فى عهد الجاهلية إذا ولد لهم مولود من تحت الليل ... فوضعت عليه الإناء فوجدته قد تفلق الإناء عنه وهو يمص إبهامه يشخب أى يسيل لبنا اهـ. (44)

ترجمہ: "حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں (قریش میں) جب کوئی بچہ رات کے وقت پیدا ہوتا تو اس کو ایک برتن کے نیچے رکھ دیا جاتا اور لوگ صبح ہونے تک اس کو نہیں دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب آنحضرت ﷺ رات کے وقت پیدا ہوئے تو آپ کو بھی ایک برتن کے نیچے رکھ دیا گیا جو ایک پیمانہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ ایک بڑا پیمانہ تھا۔ جب صبح

ہوئی تو لوگ اس پیالے کے پاس آئے مگر انہوں نے دیکھا کہ وہ پیالہ یعنی برتن پھٹ کر دو ٹکڑے ہو چکا تھا اور آنحضرت کی نگاہیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ آپؐ کی والدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہا بیان کرتی ہیں کہ میں (آپؐ کی ولادت کے بعد) آپؐ کے اوپر ایک برتن ڈھانپ دیا مگر (صبح کو) میں نے دیکھا کہ وہ برتن پھٹ کر آپ ﷺ کے اوپر سے ہٹ چکا ہے اور آپ ﷺ اس حال میں تھے کہ اپنا انگوٹھا چوس رہے تھے جس سے دودھ نکل رہا تھا۔"

اس روایت کے اثبات میں حلبی نے بچوں کے انگوٹھوں سے دودھ نکلنے کے شواہد کے طور پر ایک یہ روایت بھی نقل کی جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایسا ہر دور میں ہوتا آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلا تخصیص بچوں کی غذا کا انتظام کیا۔

أی وفی العرائس أن فرعون لما أمر بذبح أبناء بنی إسرائیل ... افقا یظهر الإسلام لموسی علیه الصلاة والسلام ویخفی الکفر. (45)

ترجمہ: "حلبی نے نقل کیا ہے کہ: عرائس میں ہے کہ فرعون نے (جب حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے ڈر سے) یہ حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والے ہر بچہ کو قتل کر دیا جائے تو عورتیں یہ کرنے لگیں کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اسے لے کر چپکے سے کسی وادی یا غار میں لے جاتیں اور اس میں بچے کو چھپا دیتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ اس بچے کے لیے فرشتوں میں سے کسی کو متعین فرما دیتے جو اس کو کھلاتا پلاتا یہاں تک کہ (بڑے ہو کر وہ بچہ) لوگوں میں آملتا (سامری جادوگر جو اسی زمانے میں پیدا ہوا تھا) اس کے ماں نے اسے بھی اسی طرح ایک غار میں چھپا دیا تھا اس کے پاس جو فرشتہ (اس کو کھلانے پلانے کے لیے) آیا وہ حضرت جبرائیلؑ تھے۔ یہ سامری اس غار میں (انگوٹھا چوسا کرتا تھا اور) اس کے ایک ہاتھ کے انگوٹھے میں سے مسکہ نکلتا تھا اور دوسرے سے شہید نکلتا تھا، اسی وجہ سے جب دودھ پینے والا بچہ بھوکا ہوتا ہے تو وہ اپنا انگوٹھا چوستا ہے۔ چنانچہ انگوٹھا چوسنے کے متعلق روایت ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے رزق رکھ دیا ہے۔ یہ سامری ایک منافق تھا جو بظاہر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے کفر کو چھپاتا تھا۔"

ان روایتوں کی موجودگی میں بھی والدین رسولِ ثقلین ﷺ سے بغض رکھنے والے سیرت نگاروں نے رسول اکرم ﷺ کو ان کی والدہ محترمہ کا دودھ پلانے کی بجائے دیگر عورتوں کا دودھ پلوادیا اور یہاں تک کیا کہ کنواری لڑکیوں کو بھی نہ بخشا اور معجزہ بیان کرڈالا یہ بھی نہ سوچا کہ جب اللہ تعالیٰ سامری جیسے مردود کے لیے اس کے انگوٹھے سے شہد اور دودھ جاری کرسکتا ہے تو وہ اپنے اس محبوب پیغمبر ﷺ کی والدہ کے خشک دودھ کو دوبارہ جاری نہیں کرسکتا۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشکل سے مشکل حالات میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے لیے اُن کی ماں کا دودھ مقدم رکھا اور ان کی رضاعت کا اہتمام کیا۔ تاریخ انبیاء میں کہیں نہیں ملتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کو اس کی والدہ کے دودھ سے محروم رکھا ہو جس نے اسے پیٹ میں رکھنے کی مشقت جھیلی ہو اور دودھ پلانے کی فضیلت کسی اور خاتون کے حصہ میں ڈالی ہو۔ بلکہ اس حوالے سے صراحت کے ساتھ آیتِ قرآنی ملتی ہے کہ:

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ۔

ترجمہ: "اور ہم نے موسیٰ پر دودھ پلانے والیوں کا دودھ پہلے ہی سے حرام کردیا۔" (46)

اسی طرح انبیاء کرامؑ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں علامہ مجلسی اپنی کتاب حیاۃ القلوب میں نقل کرتے ہیں:

و حامله شد مادر ابراهيم به ابراهيم و حملش ظاهر نشد، و چون نزديك شد ولادتش گفت: اى آزر! مرا علت مرض يا حيض روى داده است و مى خواهم از تو جدا شوم، و در آن زمان قاعده چنين بود كه در حالت حيض يا مرض زنان از شوهران جدا مى شدند. پس بيرون آمد و به غارى رفت، و حضرت ابراهيم عليه السلام در آن غار متولد شد، پس او را مهيا كرد و در قماط پيچيد و به خانه خود برگشت و در غار را به سنگ برآورد، پس خداوند قادر حكيم براى ابراهيم در انگشت مهينش شيرى قرار داد كه او مى مكيد و هر چند گاهى يك مرتبه مادر به نزد او مى آمد. (۴۰)

ترجمہ: "اس زمانے میں یہ قائدہ تھا کہ حیض یا مرض کی حالت میں عورتیں شوہروں سے الگ رہتی تھیں۔ غرض وہ گھر نکل کر ایک غار میں چلی گئیں وہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ ان کو

ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہیں چھوڑا اور غار کے دروازے کو پتھر سے بند کر دیا اور اپنے گھر واپس آئیں۔ خداوند قادر و حکیم نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے ان کے انگوٹھے میں دودھ پیدا کر دیا اُسے چوسا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اُن کی ماں اُن کے پاس آتی رہتی تھیں۔"

طبری نے اپنے ہاں اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے:

كانت قريبا منها فولدت فيها إبراهيم عليه السلام وأصلحت من شأنه ما يصنع بالمولود ثم سدت عليه المغارة ثم رجعت إلى بيتها ثم كانت تطالعه فى المغارة لتنظر ما فعل فتجده حيا يمص إبهامه يزعمون والله أعلم أن الله جعل رزق إبراهيم عليه السلام فيها ما يجيئه من مصه۔ (47)

ترجمہ: "جب حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش کا وقت قریب آیا تو رات کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی والدہ جنگل میں تشریف لے گئیں جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے۔ اس جگہ ان کی والدہ نے ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کی غرض سے ان کو ایک غار میں چھپا دیا اور اپنے گھر واپس لوٹ آئیں۔ پھر بار بار اس غار میں جاتیں تاکہ بچے کی نگہداشت کی جاسکے۔ جب آپ وہاں جاتیں تو دیکھتیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے انگوٹھے کو منہ میں لیا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے رزق کا انتظام ان کے انگوٹھے چوسنے کے ذریعہ کیا۔"

طبری نے حضرت موسیٰؑ کی پیدائش اور ان کی رضاعت کا واقعہ ایسے نقل کیا ہے:

فلما أرادت وضعه حزنت من شأنه فأوحى الله إليها أن أرضعيه فإذا خفت عليه فألقيه فى اليم وهو النيل ولا تخافى ولا تحزنى إنا رادوه إليك وجاعلوه من المرسلين۔ (48)

ترجمہ: "حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کا وقت آیا تو اللہ کی طرف سے حکم آیا کہ اسے دودھ پلایئے اور جب اس کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس ہو تو اسے دریائے نیل میں ڈال دینا اور کسی قسم کا خطرہ محسوس نہ کرنا ہم اسے پھر تمہاری طرف لوٹا دیں گے اور ہم اسے پیغمبروں میں سے بنا دیں گے۔"

ان آیات کی روشنی میں حلیمہ سعدیہ کی رضاعت ثابت نہیں ہوتی بلکہ حضرت آمنہ سلام اللہ کی رضاعت ثابت ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ اپنی روش کو کبھی تبدیل نہیں کرتا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۛ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (49)

ترجمہ: "یہ خدائی سنّت ان لوگوں کے بارے میں رہ چکی ہے جو گزر چکے ہیں اور خدائی سنت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے۔"

قرآن مجید میں آپ ﷺ کے اہلبیتؑ کے متعلق صاف طور پر اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا ہے کہ:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (سورہ احزاب: 33) (50)

ترجمہ: "بس اللہ کا ارادہ یہ ہے اے اہل بیت علیہ السّلام کہ تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔"

اس آیت کی موجودگی میں کہا جاسکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اہلبیتؑ رسول ﷺ کو ہر قسم کے رجس سے دور رکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اُس نے اپنے محبوب رسولؐ کے لیے بھی کیا ایسا ہی انتظام کیا ہوگا اور وہ اُن عورتوں کا دودھ پلوائے گا جن کا موحد ہونا ثابت نہ ہوتا ہو؟ کیونکہ اُس وقت مکہ ہی کیا بلکہ اطراف مکہ میں بھی بت پرستی عام تھی صرف رسول اکرم ﷺ کا وہ گھر جس میں آپؐ نے پرورش پائی اس لعنت سے پاک تھااور وہ ابوطالبؑ کا گھر تھا۔اس لیے یہ بات کسی طور قبول نہیں کی جاسکتی کہ آپ ﷺ نے کسی غیر موحد عورت کا دودھ پیا ہو اور معجزہ کی کیا ضرورت تھی جب اُن کی والدہ نے اُنہیں دودھ پلایا اور اگر معجزہ والی باتیں سامنے لائی جائیں تو پھر ابوطالبؑ والی بات بھی ماننی پڑے گی۔اس تمام بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دوسرا نظریہ جو کہ رسول اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ سلام اللہ علیہ کا دودھ پینے سے متعلق پایا جاتا ہے درست ہے۔

حوالہ جات

1 ۔ بحار الأنوار، العلامة شیخ محمد باقر المجلسی، مؤسسة الوفاء، بیروت، ج۱۶ ص۴۰۶؛ ج۱۷ ص ۱۱۶؛ الذریعة إلی تصانیف الشیعة، العلامة الشیخ آقا بزرگ الطهرانی، دار الأضواء، بیروت، ج۴ ص۱۶۸

2 ۔ محمد بن سعد بن منیع أبو عبدالله البصری الزهری، الطبقات الکبریٰ، المحقق : إحسان عباس، الناشر: دار صادر، بیروت، الطبعة: ۱، 1968 م، ج1، ص۱۰۸)

3 ۔ محمد بن سعد بن منیع أبو عبدالله البصری الزهری، الطبقات الکبریٰ، المحقق: إحسان عباس، الناشر: دار صادر، بیروت، الطبعة: 1، 1968 م، ج۱، ص۱۰۸)

4 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱، ص۱۰۸

5 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱ ص۱۰۹، ۱۰۸

6 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱ص۱۰

7 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱ ص۱۰۹

8 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱ص۱۱۰، ۱۰۹

9 ۔ ایضاً ۔۔۔۔۔ الطبقات الکبریٰ، ج۱ص۱۱۰

10 ۔ حسین بن محمد بن الحسن الدِّیار بَکْری (المتوفی: 966ھ)، تاریخ الخمیس فی أحوال أنفس النفیس، الناشر: دار صادر، بیروت، ج۱ص۲۲۲

11 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة ۔ 1427ھ، ج۱ص۱۲۸

12 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة ۔ 1427ھ، ج۱ص۱۴۴

13 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة ۔ 1427ھ، ج۱ص۱۲۹

14 ۔ حسین بن محمد بن الحسن الدِّیار بَکْری (المتوفی: 966ھ)، تاریخ الخمیس فی أحوال أنفس النفیس، الناشر: دار صادر، بیروت، ج۱ص۲۲۲

15 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة ۔ 1427ھ، ج۱ ص۱۴۳

16 ۔ أحمد بن أبی یعقوب بن جعفر بن وهب ابن واضح الکاتب العباسی المعروف بالیعقوبی ,تاریخ الیعقوبی, الناشر دار صادر , بیروت, ج۱ص۱۰۷

17 ۔ محمد بن محمد بن محمد بن أحمد، ابن سید الناس، الیعمری الربعی، أبو الفتح، فتح الدین (المتوفی: 734ھ)، عیون الأثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر، تعلیق: إبراهیم محمد رمضان، الناشر: دار القلم — بیروت الطبعة: الأولی، 1414/1993، ج۱ص۴۰

18 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة ۔ 1427ھ، ج۱ص۱۲۵

19 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة —1427ھ، ج۱ص۱۲۵

20 ۔ علی بن إبراهیم بن أحمد الحلبی، أبو الفرج، نور الدین ابن برهان الدین (المتوفی: 1044ھ)، الناشر: دار الکتب العلمیة، بیروت، الطبعة: الثانیة —1427ھ، ج۱ص۱۳۹

21 ۔ قرآن مجید سورہ المسد

22 ۔ قرآن مجید سورا عراف، آیت ۔ ۵۰

23 ۔ محمد بن إسحاق بن یسار المطلبی بالولاء ، المدنی (المتوفی : 151 ھ) سیرة ابن إسحاق (کتاب السیر والمغازی) تحقیق : سهیل زکار، الناشر : دار الفکر، بیروت، الطبعة : الأولی1398ھ/1978م، ص۴۸۔

24 ۔ عبد الملك بن هشام بن أیوب الحمیری المعافری أبو محمد(سنة الولادة / سنة الوفاة 213)،، السیرة النبویة لابن هشام، تحقیق طه عبد الرءوف سعد، الناشر دار الجیل، بیروت، سنة النشر 1411، ص۲۹۷

25 ۔ محمد بن سعد بن منیع أبو عبدالله البصری الزهری، الطبقات الکبری، الناشر : دار صادر — بیروت، ج۱ص۸۴

عبد الملك بن هشام بن أيوب الحميرى المعافرى، أبو محمد، جمال الدين (المتوفى: 213هـ)، السيرة النبوية لابن هشام، تحقيق: مصطفى السقا وإبراهيم الأبيارى وعبد الحفيظ الشلبى، الناشر: شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبى وأولاده بمصر، الطبعة: الثانية، 1375هـ - 1955م، ج۱ص۱۰۸

26 - ابن هشام، محمد ، السيرة النبويه، تحقيق مصطفیٰ ابراهيمى نبارى، ناشر دارلاحياء التراث العربى، بيروت، ج۱ص۶۱

27 - (محمد بن إسحاق بن يسار المطلبى بالولاء ، المدنى (المتوفى : 151 ه) سيرة ابن إسحاق (كتاب السير والمغازى) تحقيق : سهيل زكار، الناشر : دار الفكر، بيروت، الطبعة : الأولى1398ھ/1978م، ص۳۴

28 - محمد بن جرير الطبرى أبو جعفر(تاريخ الطبرى - الطبرى) الكتاب : تاريخ الأمم والرسل والملوك, الناشر : دار الكتب العلمية, بيروت, ج ۲ص۱۵۸،

29 -حسين بن محمد بن الحسن الدِّيار بَكْرِى (المتوفى: 966هـ)، تاريخ الخميس فى أحوال أنفس النفيس، الناشر: دار صادر، بيروت، ، ج۱ ص۲۲۲

30 - محمد بن إسماعيل أبو عبدالله البخارى الجعفى ،الكتاب : الجامع الصحيح المختصر، تحقيق : د. مصطفى ديب البغا أستاذ الحديث وعلومه فى كلية الشريعة، جامعة دمشق، الناشر : دار ابن كثير، اليمامة ، بيروت، الطبعة الثالثة، 1407 — 1987، حديث شمارہ: 4815

31 - أبو الحسين مسلم بن الحجاج بن مسلم القشيرى النيسابورى،: الجامع الصحيح المسمى صحيح مسلم، الناشر: دار الجيل بيروت ، دار الأفاق الجديدة ، بيروت، ج۴ص۱۶۵)

32 - أبو داود سليمان بن الأشعث السجستانى ، سنن أبى داود، الناشر: دار الكتاب العربى ، بيروت، ج۱ ص۱۷۸ شمارہ حدیث- ۲۰۵۸

33 - محمد بن يزيد أبوعبدالله القزوينى، سنن ابن ماجه، تحقيق : محمد فؤاد عبد الباقى، الناشر دار الفكر ، بيروت، ج۱ص۶۲۴ شمارہ حدیث- ۱۹۳۹

34 - محمد بن سعد بن منيع أبو عبدالله البصرى الزهرى، الطبقات الكبرىٰ، المحقق : إحسان عباس، الناشر: دار صادر، بيروت، الطبعة :۱، 1968 م، ج۱ ص۱۱۰؛ أبو القاسم على بن الحسن بن هبة الله المعروف بابن عساكر (المتوفى: 571هـ)، تاريخ دمشق، المحقق: عمرو بن غرامة العمروى، الناشر: دار الفكر للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت، عام النشر: 1415هـ - 1995م، ج۳ ص۱۱۰

35 ـ محمد بن سعد بن منيع أبو عبدالله البصري الزهري، الطبقات الكبرىٰ،المحقق : إحسان عباس،الناشر: دار

صادر، بيروت، الطبعة: ا، 1968م، ج1 ص111 ـ

36ـ عبد الرحمن بن علي بن محمد أبو الفرج، صفة الصفوة ـ ابن الجوزي، تحقيق: محمود فاخوري ـ د. محمد رواس قلعه جي، ناشر: دار المعرفة، بيروت، الطبعة الثانية، 1399—1979، ج1ص٢١

37 ـ الكليني الرازي، الأصول من الكافي، الناشر دار الكتب الإسلامية ،مرتضى آخوندی ،تهران ـ بازار سلطاني، الطبعة الثالثة، 1388، ج1 ص۴۴۸ـ

38ـ سورہ بقرہ آیت ۲۳۳

39ـ أحمد بن محمد بن أبي بكر بن عبد الملك القسطلاني القتيبي المصري، أبو العباس، شهاب الدين (المتوفى: 923هـ)، المواهب اللدنية بالمنح المحمدية، الناشر: المكتبة التوفيقية، القاهرة، مصر، ج1ص١٠١

40 ـحسين بن محمد بن الحسن الدِّيار بَكْري (المتوفى: 966هـ)، تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس، الناشر: دار صادر، بيروت، ج اص۲۲۹

41 ـ محمد بن سعد بن منيع أبو عبدالله البصري الزهري، الطبقات الكبرىٰ،المحقق : إحسان عباس،الناشر: دار صادر، بيروت، الطبعة: ا، 1968م، ج1 ص١١٦ـ

42 ـعلي بن إبراهيم بن أحمد الحلبي، أبو الفرج، نور الدين ابن برهان الدين (المتوفى: 1044هـ)، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة: الثانية ـ 1427هـ، ج1 ص١٢٩

43 ـحسين بن محمد بن الحسن الدِّيار بَكْري (المتوفى: 966هـ)، تاريخ الخميس في أحوال أنفس النفيس، الناشر: دار صادر، بيروت، ، ج1 ص۲۲۲

44 ـعلي بن إبراهيم بن أحمد الحلبي، أبو الفرج، نور الدين ابن برهان الدين (المتوفى: 1044هـ)، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة: الثانية—1427هـ، ج1 ص ۹۸ـ

45 ـعلي بن إبراهيم بن أحمد الحلبي، أبو الفرج، نور الدين ابن برهان الدين (المتوفى: 1044هـ)، الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة: الثانية—1427هـ، ج1 ص ۹۸ـ

46ـ قرآن مجید، (سورہ القصص آیت۔ ۱۲)

47۔ علامہ مجلسی، حیاۃ القلوب (اردو ترجمہ)، ناشر امامیہ کتب خانہ، مُغل حویلی اندرون موچید روازہ، لاہور۔ ج۱ ص ۲۱۵

48۔ محمد بن جریر الطبری أبو جعفر (تاریخ الطبری ۔ الطبری) الکتاب : تاریخ الأمم والرسل والملوك, الناشر : دار الکتب العلمیة, بیروت, الطبعة الأولی، 1407 ,ج۱ص ۱۴۳

49۔ محمد بن جریر الطبری أبو جعفر (تاریخ الطبری ۔ الطبری) الکتاب : تاریخ الأمم والرسل والملوك, الناشر : دار الکتب العلمیة, بیروت, الطبعة الأولی، 1407 ,ج۱ص ۲۳۳

50۔ قرآن مجید، سورہ احزاب آیت۔ ۶۲

الٰہی اقتصادیات کے بنیادی اصول (۲)

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*

sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی کلمات: الٰہیات، اقتصادیات، انسانی اقدار، استحصال، قومی پیداوار، سماجی انصاف، معیاری مصنوعات، ذخیرہ اندوزی، قرض۔

خلاصہ

الٰہیات میں اقتصادیات کی اہمیت اِس لیے ہے تاکہ انسان اعلیٰ انسانی اقدار تک پہنچ سکے۔ لہٰذا الٰہیات میں کوئی بھی فرد و معاشرہ اُس وقت تک ترقی یافتہ شمار نہیں ہوتا جب تک اُس پر اعلیٰ انسانی اقدار حاکم نہ ہوں۔ تمام انسانوں کے لیے اقتصادی ترقی کے برابر کے مواقع مہیا کرنا، بنیادی سہولیات اور قومی پیداوار کی تقسیم میں برابری اور شرعی مالیات کے ذریعے امیر و غریب کی طبقاتی تقسیم کی خلیج کم کرنا، الٰہی اقتصادیات میں سماجی انصاف کے قیام کی اہم تدبیریں ہیں۔

اسی طرح اعلیٰ معیار کی مصنوعات پیش کرنا الٰہی اقتصادیات کا ایک اہم اصول ہے۔ لہٰذا جس پیداواری یونٹ کی مصنوعات کا معیار اعلیٰ ہو، اُس کا مالک اور کارگر اعلیٰ انسانی خصوصیات کے حامل شمار ہوتے ہیں اور جس یونٹ کی مصنوعات گھٹیا ہوں، اُس کا مالک اور کارگر بھی رذیل شمار ہوتے ہیں۔ نیز الٰہی اقتصادیات کے مطابق ہر صاحبِ ایمان کا فریضہ ہے کہ اپنے ملک و ملت کی سربلندی اور استقلال کی حفاظت کے جذبے کے تحت ملکی مصنوعات کے استعمال کو غیر ملکی مصنوعات پر ترجیح دے۔ اپنے سرمائے کو کسی صورت نہ گنوائے اور اسے گردش میں رکھے۔ اسلام میں ذخیرہ اندوزی کی مذمت اور قرض کی اہمیت کا راز، راکد سرمائے کو گردش میں لانا اور سرمایہ کاری کے ذریعے سرمائے کی افزائش ہے۔

---

*۔ محقق، استاذ فلسفہ اسلامی، ڈائریکٹر نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بارہ کہو، اسلام آباد۔

اقتصادیات، کرامتِ نفس اور آبرومندی کا وسیلہ

کچھ "الٰہی اقتصادیات کے بنیادی اصول (۱)" کے عنوان کے تحت مجلّہ نورِ معرفت کے سابقہ شمارہ میں ہم نے اپنے مقالہ میں الٰہیات میں اقتصادیات کی اہمیت اور الٰہی اقتصادیات کے بنیادی خدّوخال بیان کیے۔ گذشتہ مقالہ میں ایک اساسی نکتہ یہ بیان ہوا کہ تمام الٰہی ادیان اور بالخصوص اسلام میں، انبیاء الٰہی کی بعثت اور دعوت کا ایک اہم محور، انسانی معاشرہ میں اقتصادی امور کی اصلاح تھا۔

مقالہ ہٰذا میں ہم اِس نکتہ کی مزید وضاحت میں یہ کہیں گے کہ الٰہیات اور بالخصوص اسلامی الٰہیات میں اقتصادی امور کی اصلاح بذاتِ خود کوئی ہدف نہیں ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات میں اقتصادی سرگرمیوں اور اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ بھرنے کے لیے محنت مزدوری کو اللہ تعالی کی راہ میں جہاد کے مترادف قرار دیا گیا ہے (1) تو ایسا اِس لیے نہیں کہ دیگر حیوانوں کی طرح انسان بھی اپنا پیٹ بھر سکے اور بس۔ بلکہ الٰہیات میں اقتصادیات کی یہ اہمیت اِس لیے ہے تاکہ انسان اقتصادیات کا زینہ لگا کر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار تک پہنچ سکے۔

بنابرایں، اگر ایک فرد یا معاشرہ اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ، لیکن اخلاقی لحاظ سے پسماندہ ہو، تو یہ معاشرہ کسی صورت ترقی یافتہ معاشرہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ الٰہیات میں مضبوط اقتصادیات، ترقی یافتہ ہونے کی علامت نہیں، بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار اور معاشرتی اخلاق اور حُسنِ معاشرت، ترقی کی علامت ہے۔ پس الٰہیات کے مطابق اقتصاد، کرامتِ نفس، آبرومندی اور انسانی خودی کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں کوئی بھی فرد و معاشرہ اُس وقت تک اقتصادی لحاظ سے ترقی یافتہ شمار نہیں کیا جا سکتا جب تک اُس پر اعلیٰ انسانی اقدار حاکم نہ ہوں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ الٰہیات میں کنجوسی اور بُخل لعنت شمار ہوتے ہیں، حالانکہ ظاہری طور پر یہ زر و دولت اکٹھی کرنے کا حربہ ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ کام انسانی کرامت کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ الٰہی اقتصادیات میں فقیر اور نادار تنہا وہ شخص نہیں ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو، بلکہ نادار وہ ہے جس میں انسانی کرامت نہ پائی جاتی ہو۔ لہٰذا الٰہیات میں خودی کو بیچ کر مال و دولت کمانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بقول علامہ محمد اقبال: ع

"خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر۔"

بلکہ علامہ کے بقول جو اقتصادی خوشحالی انسانی روح کے ارتقاء اور اُس کی پرواز میں آڑے ہو، اُس سے فقر و فاقہ بلکہ موت بہتر ہے:۔

اے طائر لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی　جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خلاصہ یہ کہ الٰہیات میں اقتصادی خوشحالی کا پیمانہ، تنہا ملکی پیداوار اور اقتصادی گوشواروں کی بہتری نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ، فرد اور معاشرہ پر اعلیٰ انسانی اخلاق کی حاکمیت ہے۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ اپنی اقتصادیات کو الٰہیات کی روشنی میں سدھارنا چاہتا ہے تو اُسے تنہا پیداوار بڑھانے، IMF جیسے عالمی اداروں سے امداد کے حصول اور عالمی تجزیاتی اداروں کے اعداد و شمار پر توجہ نہیں دینا چاہیے، بلکہ اپنے اندر انسانی پیشرفت کو بھی مدّ نظر رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اعلیٰ انسانی اقدار قربان کرنے کی قیمت پر کسی فرد و ملت کو اقتصادی ترقی حاصل ہوتی ہو تو یہ ترقی نہیں، تنزلی ہے۔ بقول شاعر:۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت　ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارہ

اقتصادی عدالت، الٰہی اقتصادیات کی روح

اپنے سابقہ مقالے میں ہمارا دعوی یہ بھی تھا کہ الٰہیات میں، انبیاء الٰہی کی بعثت اور دعوت کا ایک اہم محور، اقتصادی امور کی اصلاح کے ساتھ ساتھ، اقتصادی استحصال اور لوٹ مار کا سدّ باب اور اقتصادی عدالت کا قیام رہا۔ مقالہ ہذا میں بھی ہم اِس نکتہ پر مزید تاکید کریں گے کہ الٰہی اقتصادیات، اُس عادلانہ اقتصادی نظام کا نام ہے جو سماج کو برابر کی اقتصادی خوشحالی اور ترقی کے مواقع مہیا کرے۔ ایسا نظام جس میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جائے، طاغوتی اور ابلیسی اقتصادی نظام ہو سکتا ہے، الٰہی اقتصادی نظام نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اقتصادیات کا الٰہی نظام، معاشرہ میں ہر قسم کے اقتصادی استحصال کا دروازہ بند کرتا ہے اور سب انسانوں پر ترقی اور خوشحالی کی راہیں برابری کی بنیاد پر کھولتا ہے۔

اسلام کی پیش کردہ الٰہی اقتصادیات میں معاشرے سے استحصالی نظام کے خاتمے اور ہر لحاظ سے ایک عادلانہ اقتصادی نظام کے قیام کے لیے تین تدبیریں یا Mechanisms پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں الٰہیات نے اقتصادیات کی بہتی گنگا پر تین مقامات پر ایسے فلٹرز لگا دیے ہیں جو قومی مال و دولت اور سرمائے کے کسی ایک طبقہ یا چند طبقات کے پاس جمع ہوتے دھارے کو منتشر کر دیتے ہیں۔ یوں

معاشرے میں امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم دم توڑ دیتی ہے۔ یہ تین تدبیریں یا Mechanisms درج ذیل ہیں:

1. **اقتصادی ترقی اور خوشحالی کے منصفانہ مواقع (Opportunities)**: یہ ایک ایسا نظام ہے جو اقتصادیات کے پھوٹتے سرچشموں پر لگایا گیا ہے۔ اِس نظام کے ذریعے یہ تدبیر کی گئی ہے کہ تمام انسانوں کے لیے اقتصادی ترقی کے برابر کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ یعنی اپنی اقتصادیات سنوارنے کے مواقع، امیر و غریب، بادشاہ و رعایا سب کو برابر میسر ہوں۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں ہو کہ وہ کون سا اقتصادی مشغلہ اختیار کرے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اقتصادی سرگرمیوں کا جواز یا Permit دینے میں کوئی امتیاز قابل قبول نہیں ہے۔ یہ جواز قرابتوں، رشتہ داریوں، سفارشوں اور رشوتوں کے عمل دخل کے بغیر، سب کو برابری کی بنیاد پر ملنا چاہیے۔

اگر ہم تاریخ کے مختلف ادوار کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جب بھی، جس معاشرہ میں بھی یہ تدبیر بروئے کار لائی گئی اُس معاشریہ میں اقتصادی عدالت اور سماجی انصاف کی حاکمیت رہی۔ اور جب بھی اِس تدبیر کو بھلا دیا گیا، طبقاتی تقسیم کا جادو سر چڑھ بولنے لگا۔ مثال کے طور پر صدرِ اسلام میں مملکتِ مدینہ میں جب تک اقتصادی ترقی کے مواقع کی تقسیم عادلانہ رہی اور اقرباء پروری کی ہَوا و ہَوس اُس پر غالب نہ آئی، اِس معاشرے میں امیر اور غریب کی تفریق نہ ہونے کے برابر رہی۔ لیکن جب اسلامی مملکت کے اقتصادی نظام پر اقرباء پروری کے منحوس سائے منڈلانے لگے تو طبقاتی تقسیم کا ایسا دروازہ کھلا جسے اہلِ اقتدار کھولنا تو جانتے تھے، لیکن بند کرنا نہیں جانتے تھے۔

لہٰذا موجودہ دَور میں بھی کوئی نظام، اگر امیر و غریب کی تفریق کو مٹا سکتا ہے تو وہ اسلام کا پیش کردہ کاروبار اور ملازمت کے منصفانہ اور مساوی مواقع (Opportunities) فراہم کرنے کا نظام ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں تجارت کا Permit یا ملازمت کا پروانہ جاری کرنے کا تنہا معیار، استعداد اور امانت داری ہے؛ رشتہ داری، رشوت، سفارش، کسی مخصوص سیاسی پارٹی کی ممبر شپ وغیرہ

نہیں ہے۔ اس حوالے سے قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حضرت شعیب علیہ السلام کے ہاں ملازم ٹھہرنے کی داستان سبق آموز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (2)

ترجمہ: "اُن دونوں میں سے ایک لڑکی نے کہا: اے بابا! اِسے ملازم رکھ لیجیے! کیونکہ جسے آپ ملازم رکھنا چاہیں، اُن میں سب سے بہتر وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔"

اِس آیۂ شریفہ کی روشنی میں حضرت شعیب کی بیٹی کی زبانی کاروباری مواقع اور ملازم مہیا کرنے کا جو الٰہی معیار دیا گیا ہے وہ کام کرنے کی استعداد (طاقت/لیاقت) اور امانتداری ہے۔ لیکن جب کسی ملک و معاشرہ کے اقتصادی نظام میں کاروباری مواقع، ملازمت کے حصول کا معیار اور اقتصادیات کے سرچشموں تک رسائی کا حیلہ، لیاقت اور امانتداری کی بجائے رشوت اور رشتہ داری بن جاتا ہے تو یہ اقتصادی نظام دَم توڑنے لگتا ہے۔

2. **<u>پیداوار کی عادلانہ تقسیم</u>**: یہ ایک ایسا نظام یا ایک ایسی تدبیر ہے جو اقتصادیای وسائل تک رسائی کے بعد، اِن وسائل کو استعمال کرتے ہوئے حاصل ہونے والی پیداوار کی تقسیم کے موقعہ پر بروئے کار لائی گئی ہے۔ یہ *Mechanism* قومی پیداوار کی تقسیم میں بندر بانٹ نہیں چلنے دیتا۔ بلکہ تمام بنیادی سہولیات اور قومی پیداوار کی تقسیم برابری کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ یعنی اگر ایک طبقہ کو زمین اقتصادی وسیلہ کے طور پر میسر ہے اور وہ اُس سے گندم تولید کر رہا ہے اور دوسرے طبقے کو گیس یا کوئلہ میسر ہے اور وہ اُس سے بجلی بن رہا ہے تو گندم اور بجلی کے حصول کے بعد اِس پیداوار کی تقسیم برابری کی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی اقتصادیات میں قومی پیداوار کی تقسیم میں مجاہد اور غیر مجاہد، صحابی اور تابعی، قریشی اور غیر قریشی وغیرہ کا فرق روا رکھنا، جائز نہیں ہے۔ پیداوار کی تقسیم کا یہ معیار ہمیں پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن جب ہم

اسلامی ریاست کو اِس اصول کی پاسداری سے کنارہ کشی اختیار کرتا دیکھتے ہیں تو وہاں طبقاتی تقسیم کی وباء پھیلتی نظر آتی ہے۔

3. **شرعی مالیاتی فرائض (شرعی ٹیکس)**: معاشرے میں سماجی انصاف کے قیام اور طبقاتی تقسیم کے خاتمے کا تیسرا نظام، اقتصادی سرگرمیوں کے انجام یا اختتام پر رکھا گیا ہے۔ یہ نظام شرعی مالیاتی فرائض (شرعی ٹیکسز) کا نظام ہے۔ زکات، عشر، خمس، کفّارات، فدیات، قربانی اور صدقات جیسے شرعی فرائض کا نظام، دراصل، امیر اور غریب کی طبقاتی تقسیم کا دروازہ بند کرنے کا وہ نظام ہے جو پیداوار پر مالکانہ حقوق کے حصول کے بعد اِس پیداوار سے بلا شرکت غیرے، مالکانہ لذّتیں اٹھانے سے روکتا ہے۔ یہ نظام انسان کو شخصی سرمائے کے خود خواہانہ استعمال، اِسراف اور ضیاع سے روکتا ہے۔ یہ نظام نہ تنہا کسی شخص کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت اور سرمایہ ضائع کرے، گنوادے، یا فضول خرچ کر دے، بلکہ یہ نظام ہماری ذاتی ملکیت اور شخصی ثروت میں غریبوں، ناداروں اور معاشرہ کے پسماندہ افراد کو شامل کر کے معاشرے میں طبقاتی تقسیم کی بساط لپیٹنے میں مدد دیتا ہے۔

اقتصادی عدالت، سماجی انصاف کا وسیلہ

اگر ہم معاشرے میں اقتصادی عدالت کے قیام کے لیے اسلامی الٰہیات کے پیش کردہ آخری Mechanism یا تدبیر کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زکات، خمس اور صدقات وغیرہ جیسے مالیاتی فرائض کا یہ نظام، نہ تنہا اقتصادی عدالت کے قیام کا ذریعہ ہے، بلکہ اِس نظام کے ذریعے سماجی انصاف کی راہیں بھی ہموار کر دی گئی ہیں۔ کیونکہ یہ نظام تجارت و اقتصاد اور شخصی اور قومی ثروت کا ایک بہت بڑا حصہ ناداروں کی تعلیم، بے چاروں کی رفاہ اور بے یار و مددگار بیماروں کی صحت جیسی بنیادی ضروریات پر خرچ کرنے کی تجویز دیتا ہے اور یوں سماجی انصاف کے قیام کو یقینی بناتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ زکات، خمس اور صدقات یا کلی طور پر تمام شرعی ٹکیسز کے مصارف میں سے اہم ترین مصرف یا استعمال، معاشرے میں تعلیم کا فروغ ہے۔

دوسرے الفاظ میں الٰہی اقتصادیات میں تعلیمی لحاظ سے تمام اہل معاشرہ کی ترقی اور پیشرفت کے برابر کے مواقع مہیا کرنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ گویا تجارت کو تعلیم کا وسیلہ بنا دیا گیا ہے، نہ کہ تعلیم کو تجارت اور مالی منفعت کا ذریعہ۔ اگر تعلیم آمدنی کے حصول اور کسبِ منفعت کا ذریعہ بن جائے تو تعلیمی اداروں کے دروازے فقیروں اور غریبوں پر بند کر دیے جاتے ہیں جس سے سماجی ظلم و ناانصافی اور بربریّت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ لیکن اگر آمدنی اور منفعت (شرعی ٹیکسز) کو تعلیم کی راہ میں خرچ کیا جائے تو معاشرے کا کوئی فرد اَن پڑھ نہیں رہتا اور سماجی انصاف قائم کرنے میں بہترین مدد ملتی ہے۔ نیز جب شرعی ٹیکسز کو رفاہِ عامہ کے امور پر خرچ کیا جاتا ہے تو اس سے معاشرے کے پسماندہ طبقے کو خوشحال زندگی گذارنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ غریبوں کا علاج اور روزگار مہیا ہوتا ہے اور درماندہ مسافروں کے زادِ راہ کا بندوبست ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اقتصادی عدالت، دراصل، سماجی انصاف و برابری کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے اور الٰہیات میں اقتصادیات کی اصلاح اور اقتصادی عدالت کے قیام کے ذریعے سماجی انصاف و عدالت کے قیام کی راہیں ہموار کر دی گئی ہیں۔

الٰہی اقتصادیات کے احکام اور آداب

سابقہ مقالہ میں الٰہی اقتصادیات کے جن احکام اور آداب کی طرف اشارہ ہوا، اُن میں نیک نیتی سرفہرست ہے۔ اگر اقتصادی سرگرمیوں میں انسان کا انگیزہ الٰہی ہو تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ دوسروں کے لیے کمارہا ہے یا اپنے لیے، بلکہ وہ خود کو اللہ تعالی کی رازقیت کی صفت کا مظہر دیکھتا ہے اور جو رزق کماتا ہے اُسے اپنے اہل و عیال اور نادار انسانوں پر خرچ کرتے ہوئے بہترین لذت محسوس کرتا ہے۔ الٰہی اقتصادیات میں نیک نیتی کے علاوہ لین دین کے شرعی قوانین اور فقہی احکام سے آگاہی بھی بہت ضروری ہے۔ لہٰذا کاروبار میں سود، ظلم، خیانت اور دھوکہ دہی سے بچنے کے لیے اقتصادیات اور مختلف اقتصادی معاملات کے فقہی احکام سے آشنائی ضروری ہے۔

اس کے علاوہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف افراد کے لیے اقتصادیات کے علم سے آشنائی بھی ضروری ہے۔ ایک اقتصادی کارکن کے لیے اقتصادی معاملات کی اونچ نیچ سے آگاہی اور اقتصادی بصیرت ضروری ہے۔ اسلامی فقہ نے اقتصادی سوجھ بوجھ نہ رکھنے والوں پر پابندی عائد کر دی ہے تاکہ وہ اقتصادی معاملات انجام نہ دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ نابالغ، دیوانے اور ایسے سادہ لوح انسان

جو ضروری اقتصادی بصیرت نہ رکھتے ہوں، اسلامی فقہ ان کے اقتصادی معاملات کو نافذ قرار نہیں دیتی اور بعض اوقات مسلمان حکمران کو یہ فریضہ سونپتی ہے کہ وہ ایسے اشخاص کو حتی کہ خود ان کے اپنے سرمایے میں تصرف سے روک دے۔ ذیل میں ہم الٰہیات کی روشنی میں اقتصادی سرگرمیوں کے چند مزید احکام وآداب بیان کریں گے:

معیاری مصنوعات

چونکہ بات الٰہی اقتصادیات پر ہو رہی ہے لہٰذا اسے الٰہیات سے جدا کرکے نہیں دیکھا جا سکتا۔ الٰہیات اور بالخصوص اسلامی الٰہیات میں عالمِ ہستی کی تخلیق میں کمال کا معیار پایا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی کی ایک صفت "احسن الخالقین" یعنی: "بہترین خلق کرنے والا" بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالی نے کائنات کی ہر چیز محکم و متین بنائی ہے۔ اُس کی خلقت میں کوئی نقص، بگاڑ یا خلل نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:

... مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ (3)

ترجمہ: "تم (خدائے) رحمان کے نظامِ تخلیق میں کوئی بگاڑ نہیں دیکھو گے۔ سو تم نگاہِ پھیر کر دیکھو (اور غور کرو کہ) کیا تمہیں کوئی شگاف یا خلل نظر آتا ہے؟ (یقینا نہیں!) تو پھر نگاہِ کو جولان دو، لیکن ہر بار تمہاری نظر تمہاری طرف تھک کر اِس حال میں پلٹے گی کہ (کوئی بھی نقص تلاش کرنے میں) ناکام ہو گی۔"

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ إِنَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَفْعَلُونَ

ترجمہ: "آپ پہاڑ کو جامد سمجھتے ہو حالانکہ یہ بادلوں کی طرح چل رہا ہے۔ اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شئے کو محکم بنایا ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے آگاہ ہے۔" (4)

ان آیات کے مطابق اللہ تعالی کی تخلیق بہت معیاری اور مضبوط ہے۔ اب اسلامی الٰہیات میں ایک مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر الٰہی صفات کی تجلی پیدا کرے۔ اُس کے افعال و کردار پر الٰہی رنگ

غالب ہونا چاہیے۔ لہٰذا ہمیں کئی آیات و روایات سے یہی سبق ملتا ہے کہ ہم بھی جب کوئی کام انجام دیں، کچھ ایجاد کریں یا کوئی پروڈکٹ بازار میں لائیں تو اُس میں کمال کا معیار ہونا چاہیے۔ یہ چیز امکان کی آخری حدّ تک معیاری، مضبوط اور پائیدار ہونی چاہیے۔

اِس حوالے سے یہ حدیث انتہائی قابل توجہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کے بیٹے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا اور انہیں دفن کر دیا گیا تو آنحضرت ﷺ نے دیکھا کہ قبر میں کجی ہے تو اُسے درست کیا اور پھر فرمایا:

اذا عمل احدکم عملا فلیتقن (5)

یعنی: "آپ میں سے جو شخص بھی کوئی کام انجام دے، اُسے محکم طریقے سے انجام دے۔"

نیز آنحضرت ﷺ ہی سے منقول ہے کہ جب آپ سعد ابن معاذ کی قبر میں اترے تو ان کی قبر کے پتھروں کے درمیان پائی جانے خالی جگہوں کو گیلی مٹی سے بھرا اور پھر فرمایا:

انی لأعلم انّه سیبلی و یصل الیه البلاء و لکن الله یحبّ عبدا اذا عمل عملا أحکمه (6)

یعنی: "یقیناً میں جانتا ہوں کہ یہ قبر بہت جلد بوسیدہ ہو جائے گی اور ویرانی اس کا مقدّر بن جائے گی، لیکن اللہ تعالی کو وہ بندہ محبوب ہے جو جب بھی کوئی کام انجام دے تو اُسے محکم انجام دے۔"

اسی طرح حضرت امام علی علیہ السلام اپنے ایک نورانی فرمان میں ارشاد فرماتے ہیں:

قیمة کلّ امریء ما یحسنه (7)

یعنی: "ہر شخص کی حسنِ کارکردگی اُس کی قیمت ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ علیہ السلام کی نظر میں اگر ایک شخص کی کارکردگی اور اُس کے کام کا معیار اعلیٰ ہے تو وہ ایک اعلیٰ انسان ہے اور اگر ایک شخص کی کارکردگی اور اُس کے کام کا معیار گھٹیا ہے تو درحقیقت، خود یہ شخص گھٹیا ہے۔ بنابرایں، یوں تو ہر میدان میں اور بالخصوص مصنوعات کے میدان میں جس پیداواری یونٹ کی مصنوعات کا معیار اعلیٰ ہے، دراصل، یونٹ کا مالک اور کارگر اعلیٰ انسانی خصوصیات کے حامل ہیں اور جس پیداواری یونٹ کی مصنوعات گھٹیا ہیں، اُس یونٹ کا مالک اور اس کے کارگر رذیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام کے حقیقی پیشواؤں نے اپنے ماننے والوں کو گھٹیا مصنوعات کی خرید و

فروخت سے بھی روکا ہے۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ :

فی الجیّد دعوتان و فی الردی دعوتان یقال لصاحب الجیّد : بارك الله فیك و فیمن باعك و یقال لصاحب الردی: لا بارك الله فیك و لا فیمن باعك (8)

یعنی: "معیاری چیز میں دو دعائیں ہیں۔ معیاری چیز [سے مخاطب ہو کر اُس کے] پیش کرنے والے کے حق میں یہ دعا کی جاتی ہے کہ : اللہ تعالی تجھ میں برکت ڈالے اور جس نے تجھے بیچا اُسے بھی برکت عطا فرمائے۔ اور غیر معیاری چیز میں دو بد دعائیں ہیں۔ غیر معیاری چیز [سے مخاطب ہو کر اُس کے] پیش کرنے والے کے حق میں بد دعا کی جاتی ہے کہ : اللہ نہ تجھ میں برکت ڈالے، نہ تیرے بیچنے والے کو برکت عطا فرمائے۔"

الکافی کے اسی باب امام صادق علیہ السلام ہی سے یہ روایت بھی نقل ہوئی ہے کہ آپ نے عاصم بن حمید سے فرمایا کہ :

"معیاری جنس خریدو اور معیاری جنس بیچو کہ جب تم معیاری جنس بیچو گے تو معیاری جنس سے کہا جائے گا کہ : اللہ تجھ میں برکت رکھے اور تجھے بیچنے والے کو برکت عطا فرمائے ! " (9)

خلاصہ یہ کہ ان آیات و روایات سے ایک مؤمن انسان کو بہت واضح پیغام ملتا ہے کہ اُس کا ہر کام معیاری ہونا چاہیے۔ ہر کام کی طرح مسلمانوں کی مصنوعات میں بھی کمال کا معیار پایا جانا چاہیے۔ جس امّت کے نبی ﷺ ایک قبر کو بھی محکم و مضبوط بنانے کا حکم دیتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے وصی (علیہ السلام) انسان کی قیمت ہی اُس کے حسنِ کارکردگی کو قرار دیتے ہیں، آیا اِن ہستیوں کی نظر میں مسلمانوں کی مصنوعات کو معیاری، پائیدار اور مضبوط و محکم نہیں ہونا چاہیے ؟

یقینا جواب یہی ہے کہ مسلمانوں کی مصنوعات میں کمال کا معیار، نبی اکرم ﷺ اور آپ (ص) کے جانشینوں کا حکم اور تمنّا و آرزو ہے۔ اپنی مصنوعات میں اعلیٰ معیار قائم کرنا، حقیقی مسلمان ہونے کی علامت اور عشقِ مصطفیٰ کا تقاضا ہے۔ مصنوعات کا غیر معیاری ہونا اور اجناس میں دو نمبری اور کھوٹ نفاق ہے اور مسلمانی سے کوسوں دور ہو جانے کے مترادف ہے۔ لہٰذا الٰہی اقتصادیات میں ہر کارخانہ دار اور ہر پیداوار ای یونٹ کا ایک اساسی فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر لے جائیں۔

ملکی مصنوعات کی ترویج

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے الٰہی اقتصادیات میں مال و دولت کمانا بذات خود کوئی ہدف نہیں ہے۔ بلکہ ہدف کمائی ہوئی دولت کے ذریعے آزادی، استقلال، انسانی خودی اور آبرومندی کی حفاظت ہے۔ دین اسلام کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ممالک اور معاشرے اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہوں اور اقتصادی لحاظ سے کوئی دبے دین طاقت انہیں مفلوج نہ کرسکے۔ یہ اصول ہمیں قرآن کریم کے اس نورانی ارشاد سے حاصل ہوتا ہے جس میں فرمایا گیا:

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (10)

یعنی: "اور اللہ نے کافرین کو مؤمنین پر بالکل کوئی برتری عطا نہیں کی۔"

یقینا مسلمانوں پر کافروں کو اقتصادی برتری بھی حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا یہ ہدف پورا کرنے کے لیے اسلامی ممالک کے باشندوں کا فریضہ بنتا ہے کہ وہ ملکی مصنوعات کو غیر ملکی، بالخصوص بے دین ممالک اور معاشروں کی مصنوعات پر ترجیح دیں۔ کیونکہ بے دین سرمایہ داروں اور سرمایہ دارانہ نظاموں کی غلامی سے نجات کا تنہا راستہ یہی ہے کہ خداپرست افراد، معاشرے اور ممالک، لادینی اقتصادی نظاموں کے مرہونِ منت نہ ہوں۔

لہٰذا ہر صاحبِ ایمان کا فریضہ ہے کہ اپنے ملک و ملت کی سربلندی اور استقلال کی حفاظت کے جذبے کے تحت اقتصادی سرگرمیوں میں حصہ لے۔ اور اگر اُس کی ملکی مصنوعات کا معیار چاہے کم بھی ہو، تب بھی ان کے استعمال کو ترجیح دی جائے۔ کیونکہ بازار میں کوئی بھی محصول، پہلے دن کامل اور معیاری صورت میں سامنے نہیں آتا۔ جوں جوں ایک محصول کی عمر گذرتی جاتی ہے، اُس کے نقائص سامنے آتے جاتے ہیں اور جوں جوں کسی محصول کی طلب بڑھتی جاتی ہے، کارخانہ دار اور تولید کنندہ، اس محصول کے نقائص دور کرتے ہوئے اسٹنڈرڈز کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ کوئی بھی معیاری سے معیاری پروڈکٹ، روزِ اوّل معیاری نہ تھی۔

ہو سکتا ہے قلیل مدّت میں داخلی مصنوعات کا معیار کم ہونے کی وجہ سے انہیں جلد Replace کرنا پڑے کرنا اور یہ کام کسٹمر کے لیے زیادہ قیمت ادا کرنے کا تقاضا کرے لیکن جب داخلی مصنوعات کا معیار بن جائے تو خارجی مصنوعات کے مقابلے میں وہی اجناس گاہک کو انتہائی سستے داموں میسّر ہوں گی۔

دراصل، ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم تنہا موجودہ قیمتوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم دس فیصد سستے داموں ایک ایسی چیز خریدنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو زندگی بھر، بلکہ ہماری کئی نسلوں کو اُسی قیمت پر خریدنا پڑتی ہے۔
لیکن اگر ہم صبر سے کام لیں اور ملکی مصنوعات کو ترجیح دیں تو ہماری آنے والے نسلوں کو یہ مصنوعات بغیر کسٹم ڈیوٹی اور دیگر دسیوں ٹیکسز ادا کیے خریدنے کا موقعہ فراہم آ جائے گا۔اور یوں ہم غیر ملکی کمپنیوں اور اقتصادی سامراج کے چنگل سے نجات پا کر اپنے استقلال و آزادی اور ملکی و ملی سرمائے کی حفاظت کر سکیں گے اور اربوں روپے کا زرِ مبادلہ بھی بچ جائے گا۔پس جہاں الٰہی اقتصادیات کا ایک اساسی اصول، اعلیٰ معیار کی مصنوعات پیش کرنا ہے، وہاں ایک کسٹمر کی حیثیت سے ہر صورت داخلی مصنوعات کو بیرونی اور غیر ملکی مصنوعات پر ترجیح دینا ہے۔

سرمائے کی حفاظت

الٰہی اقتصادیات میں شخصی اور قومی سرمائے کو ضائع ہونے سے بچانا، ایک اہم الٰہی فریضہ ہے اور کسی صورت سرمائے کو ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔اس حوالے سے رسولخدا ﷺ کا فرمان ہے:

من المروّۃ استصلاح المال (11)

یعنی: "سرمائے کی اصلاح، مردانگی ہے۔"

اسی آپ ﷺ ہی کا فرمان ہے:

نعم العون علی تقوی اللہ الغنی (12)

یعنی: "اللہ تعالی کی اطاعت (تقوی) پر بہترین مددگار، ثروتمندی ہے۔"

حضرت امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ:

اصلاح المال من الایمان (13)

یعنی: "سرمائے کی اصلاح، ایمان کی علامت ہے۔"

حمید بن زیاد نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ آیا فلاں شخص نے اپنی زمین بیچ دی ہے؟ میں نے جواب دیا: جی ہاں! اس پر آپ نے فرمایا:

مکتوب فی التوراۃ انہ من باع ارضا أو ماء ولم یضعہ فی ارض او ماء ذھب ثمنہ محقا (14)

یعنی: "تورات میں مکتوب ہے کہ جو شخص زمین یا پانی [آبیاری کا وسیلہ] بیچ کر اِس سرمائے کو خود زمین اور پانی [آبیاری کے وسیلہ] پر نہ لگائے تو اُس کا سرمایہ نابود ہو جائے گا۔"

یقیناً اس روایت میں زمین اور پانی کا ذکر جائیداد (Property) کے دو نمونوں کی طور پر ہوا ہے۔ لہٰذا جائیداد کی دیگر صورتوں کا حکم بھی یہی ہے کہ انسان کو کسی صورت اپنی جائیداد گنوانا نہیں چاہیے اور اپنے سرمائے کی حفاظت کرنا چاہیے۔ لہٰذا اگر وہ اپنی جائیداد بیچتا ہے تو اُس سے ملنے والی قیمت کو ضائع نہ کر دے بلکہ اُسے جائیداد بیچ کر جائیداد ہی بنانا چاہیے۔

الٰہی اقتصادیات میں سرمائے کی حفاظت کا ایک اہم نمونہ فضول خرچی اور اسراف سے بچنا ہے۔ اسلام نے فضول خرچی کی شدید مذمت کی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم میں فضول خرچ کو شیطان کا بھائی قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (15)

ترجمہ: ...اور فضول خرچی مت کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے پالنے والے کا منکر ہے۔"

اس آیۂ کریمہ کی روشنی میں فضول خرچی (سرمائے کا ضیاع) ایک شیطانی کام قرار دیا گیا ہے اور اِس بُرے کام کی بازگشت کفر کو قرار دیا گیا ہے۔ الٰہی تعلیمات کی روشنی میں سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچانا اور درست جگہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح سرمائے کو گردش میں رکھنا بھی الٰہی تعلیمات کی روشنی میں سرمائے کے ضیاع کا سدّ باب ہے۔ کیونکہ سرمائے کو دبا بچا کر رکھ لینا اور گردش میں نہ ڈالنا، عذاب الٰہی کے نازل ہونے کا موجب ہے۔ علی ابن ابراہیم نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے یہ روایت نقل کی ہے کہ:

ما يخلف الرجل شيئا اشدّ عليه من المال الصامت، قلت كيف يصنع به ؑ قال: يجعله في الحائط يعني في البستان أو الدّار (16)

یعنی: "کوئی شخص راکد مال سے بڑھ کر اپنے لیے (عذاب کا موجب) کوئی چیز نہیں چھوڑتا۔" [روای کہتا ہے:] میں نے پوچھا کہ: پس انسان اپنے سرمائے کا کیا کرے؟ فرمایا: "اُسے گھر یا باغ خریدنے پر خرچ کرے۔"

لہٰذا سرمائے کو گردش میں رکھنا اور ذخیرہ اندوزی سے پرہیز، الٰہی اقتصادیات کا ایک اہم اور سنہری اصول ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (17)

ترجمہ: "اور جو لوگ سونے اور چاندی کو ذخیرہ کرکے رکھتے ہیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔"

اس آیت میں "کنز" کا کلمہ، ذخیرہ اندوزی کے معنوں میں ہے۔ نہ کہ زیادہ مال و دولت جمع کرنے کے معنی میں۔ لہٰذا اسلام میں زیادہ مال و دولت کمانا، باعث غضبِ الٰہی نہیں ہے۔ بلکہ مال کو ذخیرہ کرنا اور گردش میں نہ لانا غضبِ الٰہی کا موجب ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بجا طور پر ہماری توجہ اس نکتہ پر دلائی ہے کہ:

انّ الاسلام لایحدّ اصل الملك من جهة الكميّة بحدّ فلو كان لهذا الكانز اضعاف ...(18)

یعنی: "اسلام مال کی مقدار کے لحاظ سے مال کے کوئی حدّ معین نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر اس ذخیرہ اندوز کے پاس جو کچھ اُس نے [سونا چاندی ذخیری کر رکھا ہے] اُس سے کئی گنا زیادہ مال بھی موجود ہو لیکن وہ اس مال کو گردش میں ڈال دے تاکہ اس مال کے ذریعے خرید و فروخت سے خود کو اور دوسروں کو نفع پہنچائے تو ہرگز اس کام میں کوئی دینی ممانعت نہیں ہے۔"

اگر ہم اسلامی تعلیمات میں قرض کی اہمیت کا مطالعہ کریں تو اِس میں بھی یہ نکتہ واضح طور نظر آتا ہے کہ قرض دراصل، راکد سرمائے کو گردش میں لانے کا نام ہے۔ کیونکہ قرض دینے والے کے پاس ضرورت سے اضافی مال پڑا ہوتا ہے اور قرض خواہ وہی مال لے کر اپنی ضرورت پر خرچ کرتے ہوئے اِس راکد مال کو گردش میں ڈال دیتا ہے اور یوں سرمائے کی افزائش کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ اگر ہم قرض کی آیات پر نگاہ دوڑائیں تو ان میں سرمائے کی افزائش کا عنصر واضح نظر آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (19)

ترجمہ: "کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تاکہ اللہ اِس قرض کو اُس کے لیے کئی گنا کر دے اور اُس کے لیے پسندیدہ اجر ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ(20)

ترجمہ: "کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تاکہ اللہ اِس قرض کو اُس کے لیے کئی گنا بڑھا دے، اللہ ہی تنگی اور وسعت عطا کرتا ہے اور تمہیں اُسی کی بارگاہ میں لوٹ کر جانا ہے۔"

سرمائے کو ضیاع سے بچانے کا ایک اور طریقہ، مختلف اقتصادی میدانوں میں سرمایہ کاری ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے سرمایہ دار نے جس اقتصادی فیلڈ میں سرمایہ لگایا ہو وہ مندے کا شکار ہو جائے اور یوں اُس کا سب سرمایہ ڈوب جائے۔ الٰہی تعلیمات میں ہماری توجہ اِس نکتہ کی طرف بھی مبذول کروائی گئی ہے۔ ایک شخص حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں پہنچا اور خیر خواہانہ لہجے میں کہنے لگا: آپ نے کیوں اپنا سرمایہ مختلف امور پر لگا رکھا ہے، حالانکہ اگر ایک جگہ لگاتے تو خرچہ کم ہوتا اور آمدنی زیادہ ہوتی۔ آپ نے فرمایا کہ:

اتخذتها متفرقة فان اصاب لهذا المال شیء سلم لهذا المال و الصرة تجمع بهذا کله (21)

یعنی: "میں نے اس لیے اسے جدا جدا کر دیا ہے تاکہ اگر ایک مال میں نقصان ہو تو دوسرا مال محفوظ رہے اور سب کا منافع تو ایک ہی جیب میں جانا ہے۔"

حوالہ جات

1 ۔ اس حوالے سے یہ حدیث جو پیغمبر اکرم ﷺ سے منقول ہے کہ آپ (ص) نے فرمایا: الکاد علی عیاله کالمجاهد فی سبیل الله۔

یعنی: "جو شخص اپنے اہل و عیال کا سامان زندگی مہیا کرنے کی غرض سے کام کرے، وہ اس شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے"۔ (میزان الحکمۃ، ج۲، ص ۱۰۷۴ بحوالہ بحار الانوار اور فقہ الرضا میں ابن بابویہ نے پیغمبر اکرم ﷺ سے نقل کی ہے۔ لیکن انہی الفاظ کے ساتھ یہ حدیث الکافی (ج۵، ص۸۸) میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔

2 ۔ القصص/۲۸

3 ۔ الملک/۳، ۴۔

4 ۔ النمل/۸۸۔

5 ۔ الحر العاملی، وسائل الشیعہ، مؤسسۃ اہل البیت، ج ۳، ص ۲۲۹، قم، ایران۔

6 ۔ ایضا، ص ۲۳۰۔

7 ۔ نہج البلاغہ، الشیخ محمد عبدہ، دار الذخائر، ج ۴، ص ۱۸، قم، ایران۔

8 ۔ الشیخ الکلینی، الکافی، دار الکتب الاسلامیہ، ج ۵، ص ۲۰۲، تہران، ایران۔

9 ۔ اشتر الجیّد و بع الجیّد، فانّ الجیّد اذا بعته قیل له: بارك الله فیك و فیمن باعك۔

10 ۔ النساء/ ۲۹۔

11 ۔ الحر العاملی، وسائل الشیعہ، ج ۱۷، ص ۶۴۔

12 ۔ الشیخ الکلینی، الکافی، ج ۵، ص ۱۷، تہران، ایران۔

13 ۔ الشیخ الصدق، من لایحضرہ الفقیہ، منشورات جامعۃ المدرسین، ج ۳، ص ۱۶۶، قم، ایران۔

14 ۔ ایضا، ص ۹۱۔

15 ۔ الاسراء ۲۶/ ۲۷۔

16 ۔ ایضا۔

17 ۔ التوبہ/ ۳۴۔

18 ۔ طباطبائی محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، منشورات جامعۃ المدرسین، ج ۹، صص ۲۵۱، قم، ایران۔

19 ۔ الحدید/ ۱۱۔

20 ۔ البقرہ/ ۲۴۵۔

21 ۔ الکلینی، الکافی، ج ۵، ص ۹۱۔

نہج البلاغہ کی روشنی میں

حکومت کی ضرورت واہمیت

روشن علی*

roshanali007@yahoo.com

کلیدی کلمات: حکومت،امام،والی،ولی امر،حاکم،القیم،رعایا،اُمت۔

خلاصہ

نہج البلاغہ میں حکومت کی ضرورت اور اہمیت کے مسئلے کو امام علیؑ نے خاص حکیمانہ روش سے بیان کیا ہے۔ آپؑ خود حکومت کا عملی تجربہ کر رہے تھے اور اس کی مشکلات سے آگاہ تھے۔ لہٰذا آپؑ نے اس موضوع پر عملی تجربات کی روشنی میں رہنمائی فرمائی۔ امامؑ نے حکومت، حاکم اور عوام کے لئے کون سے الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی ہیں، یہاں ان کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور ان سب کی مثالیں نہج البلاغہ کے مختلف خطبات سے پیش کی گئی ہیں۔ پھر امام علیؑ نے امام، والی اور ولی امر کے لئے کچھ فرائض بیان کئے ہیں اور حاکم ورعایا کے متقابل حقوق کو ذکر کرتے ہوئے حکومت کی ضرورت بیان کی ہے۔ آپؑ خوارج کے مغالطوں کے جواب میں واضح کرتے ہیں کہ کائنات پر اصلی حاکمیت اللہ ہی کی ہے لیکن اُس کے قوانین کے اجرا کے لئے کوئی نہ کوئی حاکم ہونا ضروری ہے۔ پھر حاکم کے فرائض بیان کرتے ہیں کہ حاکم اپنے آپ کو اپنی عوام کے غریب فرد کی زندگی پر رکھے۔ پھر اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ حکومت حق ہے یا فریضہ؟ امیر المومنینؑ اپنے مختصر سے بیان میں حکومت کو حق بھی سمجھتے ہیں اور فریضہ بھی۔

* ۔اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز،ایف10/3اسلام آباد

مقدمہ

نہج البلاغہ میں حکومت کا مسئلہ ،اس عظیم کتاب میں زندگی کے دوسرے سینکڑوں مسائل کے مانند محققین اور مولفین کی روش کے برخلاف دوسری روش کو پیش کیا ہے۔ البتہ ایسا بھی نہیں ہے کہ حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) نے حکومت کے بارے میں نیا باب یا نئی فصل بیان کی ہو اور مقدمات کو ترتیب دے کر نتیجہ گیری کی ہو، دوسرے ابواب کی طرح اس باب میں بھی ان کے کلام اور گفتگو کی روش ایک حکیمانہ روش ہے یعنی مقدمات سے عبور کرکے نتیجہ پر غور و خوض کرنا۔ لیکن ایک بزرگ حکیم کے نظریہ کے مانند ہے، جو سرچشمۂ وحی سے قریبی رابطہ رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ نہج البلاغہ میں حکومت کا مسئلہ ایک تجریدی بحث کی صورت میں نہیں ہے، چونکہ حضرت امام علی علیہ السلام حکومتی امور سے سروکار رکھتے تھے حاکم کے عنوان سے اور اس شخص کے عنوان سے گفتگو کی ہے، جو اسلامی ملک کے چلانے میں مختلف مشکلات ومصائب اور دوسری پریشانیوں سے دچار ہو اور مختلف پہلوؤں سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے ہم یہاں پر حکومت کے متعلق آپ علیہ السلام کے نظریات کو جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کریں گے ترجمہ کے لیے مفتی جعفر حسین کے نسخہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ بہترین مسائل جن کی طرف ہماری زیادہ توجہ ہونی چاہیئے مندرجہ ذیل مسائل ہیں:

حکومت کے معنی ومفہوم

سب سے پہلے ہم کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کیا حکومت حضرت امام علی (علیہ السلام) کی نظر میں اسی معنی میں ہے جو نئی اور پُرانی دنیا کی تہذیب و تمدن میں رائج ہے؟ یعنی حکومت، فرمانروائی، سلطہ، حاکمیت کے ہم معنی و مترادف ہے گاہ بہ گاہ حاکم یا حکّام امور زندگی میں کچھ امتیازات اور برتری کے حامل ہوتے ہیں یا نہیں؟ "حکومت" نہج البلاغہ کے ادب میں دوسرا مفہوم رکھتا ہے؟

ہم اس باب میں نہج البلاغہ کے چند کلمہ اور مشخص اصطلاح سے استفادہ کریں گے، حاکم کے لئے امام، والی، ولی امر اور القیم، حکومت کے لیے الامر اور الامرۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور عوام کے لئے رعیۃ اور امۃ کے الفاظ۔ ان میں سے چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔

حاکم کے لیے استعمال کئے گئے الفاظ

عربی زبان کی مرسوم تعبیرات میں حاکم کے لئے مندرجہ ذیل تعبیرات وعناوین پائے جاتے ہیں۔ سلطان اور مَلِک، کلمۂ سلطان کے بطن میں "حاکم میں سلطہ" کا مفہوم پایا جاتا ہے یعنی جو شخص حاکم ہے سلطہ گری کے پہلو کی وجہ سے قابل توجہ ہے دوسرے عوام کے امور زندگی میں مداخلت نہیں کر سکتے لیکن وہ کر سکتا ہے۔ ملک، ملوکیت، مالکیت میں عوام کے تملّک کے مفہوم یا لوگوں کے سرنوشت کے تملّک کو شامل ہے۔ نہج البلاغہ میں اسلامی سماج کے حاکم کو ہرگز ملک یا سلطان کے عنوان سے یاد نہیں کیا گیا ہے لیکن سلطان کا لفظ صرف اللہ تعالی کی بادشاہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

نہج البلاغہ کی تعبیرات میں ایک تعبیر امام سے لی گئی ہے جس کے معنی رہبر وپیشوا کے ہیں۔ رہبر وہ شخص ہے کہ اگر ایک گروہ یا ایک امت کو اپنے پیچھے چلاتا ہے تو وہ خود سب سے آگے آگے ہوتا ہے۔ حرکت اور پیش روئی اور آگے بڑھنے کا مفہوم اس راستے میں جہاں پر لوگ حرکت کرتے ہیں، امام کے معنی و مفہوم میں پایا جاتا ہے۔ نہج البلاغہ میں حاکم اور حکومت کے لیے جو اصطلاحات استعمال کی گئیں ان کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا گیا۔ اب عوام کے لیے جو الفاظ استعمال کیا گیا ہے ان جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

امام

إِنَّهُ لَيْسَ عَلَى الْإِمَامِ إِلَّا مَا حُمِّلَ مِنْ أَمْرِ رَبِّهِ الْإِبْلَاغُ فِي الْمَوْعِظَةِ۔ (1)

ترجمہ: "امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی باتیں ان تک پہنچائے اور انہیں نصیحت کرنے میں پوری پوری کوشش کرے۔ سنت کو زندہ رکھے۔ جن پر حدلاگو ہوتی ہے ان پر حد جاری کرے اوران حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ہے:

اعْلَمْ أَنَّ أَفْضَلَ عِبَادِ اللهِ عِنْدَ اللهِ إِمَامٌ عَادِلٌ هُدِيَ وَ هَدَى فَأَقَامَ سُنَّةً مَعْلُومَةً وَ أَمَاتَ بِدْعَةً مَجْهُولَةً۔ (2)

ترجمہ: "یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک سب بندوں سے بہترین وہ بندہ ہے جو عادل و انصاف پرور حاکم ہے جو خود بھی ہدایت پائے اور دوسروں کو بھی ہدایت کرے اور جانی پہچانی سنت کو مستحکم کرے اور انجانی بدعتوں کو فنا کرے۔"

دوسری تعبیر والی ہے

کلمۂ والی ولایت یا ولایت سے اخذ کیا گیا ہے اس کلمہ کے مشتقات پر توجہ کرتے ہوئے اس کے مورد نظر پہلو کی طرف پہنچا جاسکتا ہے ۔لغت میں ولایت کے معنی دو چیز کے درمیان اتصال و ارتباط کے ہیں۔ولایت یعنی دو چیز کو آپس میں اس طرح متصل ہو جانا جن کے درمیان کسی چیز کا فاصلہ نہ ہو، یعنی مکمل ارتباط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ ولایت کے معنی ہیں البتہ ولایت کے دوسرے معنی بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

ولایت بمعنی محبت، ولایت بمعنی سرپرستی، ولایت بمعنی غلام کاآزاد کرنا، ولایت بمعنی مولا یاغلام، (ان تمام معنی سے) یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ ولایت کے معنی میں جن نوع ارتباط کو ذکر کیا جاتا ہے وہ سب کے سب ارتباط اور پیوند واتصال کے مصادیق ہیں، قوم اور رعایا کا والی، وہ شخص ہے جو لوگوں کے امور کا ذمہ دار ہے اور ان سے ارتباط رکھتا ہے۔ حضرت امیر المومنین علیہ السلام اور نہج البلاغہ کی نظر میں حکومت کا یہی معنی ہے۔اس کی چند مثالیں درج ذیل پیش کی جارہی ہیں :

الوالی

وَ قَدْ عَلِمْتُمْ أَنَّهُ لَا يَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ الْوَالِي عَلَى الْفُرُوجِ وَ الدِّمَاءِ وَ الْمَغَانِمِ وَ الْأَحْكَامِ وَ إِمَامَةِ الْمُسْلِمِينَ الْبَخِيلُ فَتَكُونَ فِي أَمْوَالِهِمْ نَهْمَتُهُ وَ لَا الْجَاهِلُ فَيُضِلَّهُمْ بِجَهْلِهِ وَ لَا الْجَافِي فَيَقْطَعَهُمْ بِجَفَائِهِ وَ لَا الْحَائِفُ لِلدُّوَلِ فَيَتَّخِذَ قَوْماً دُونَ قَوْمٍ وَ لَا الْمُرْتَشِي فِي الْحُكْمِ فَيَذْهَبَ بِالْحُقُوقِ وَ يَقِفَ بِهَا دُونَ الْمَقَاطِعِ وَ لَا الْمُعَطِّلُ لِلسُّنَّةِ فَيُهْلِكَ الْأُمَّةَ ۔ (3)

ترجمہ : " تمہیں یہ معلوم ہے کہ ناموس ، خون ، مال غنیمت ، احکام اور مسلمانوں کی امامت و رہبری کے لیے کسی طرح مناسب نہیں کہ کوئی بخیل حاکم ہو کیونکہ اس کا دانت مسلمانوں کے مال پر لگا رہے گا نہ کوئی جاہل حاکم ہو کیونکہ وہ اپنی جہالت کی وجہ سے گمراہ کرے گا۔نہ کوئی ظالم حاکم ہو کیونکہ وہ اپنے ظلم اور جور سے لوگوں کو پریشان کردے گا۔نہ کوئی مال اور دولت میں بے راہ روی کرنے والا ہو کیونکہ وہ کچھ لوگوں کو دے گا اور کچھ لوگوں کو محروم کردے گا اور نہ فیصلہ کرنے میں رشوت لینے والا ہو کیونکہ وہ دوسروں کے حقوق کو رائیگاں کردے گا اور انہیں

انجام تک نہ پہنچائے گا اور نہ کوئی سنت کو بیکار کرنے والا حاکم ہو کیونکہ وہ امت کو تباہ وبر باد کر دے گا۔"

وَ أَعْظَمُ مَا افْتَرَضَ سُبْحَانَهُ مِنْ تِلْكَ الْحُقُوقِ حَقُّ الْوَالِي عَلَى الرَّعِيَّةِ وَ حَقُّ الرَّعِيَّةِ عَلَى الْوَالِي فَرِيضَةٌ فَرَضَهَا اللهُ سُبْحَانَهُ لِكُلٍّ عَلَى كُلٍّ فَجَعَلَهَا نِظَاماً لِأُلْفَتِهِمْ وَعِزّاً لِدِينِهِمْ۔ (4)

ترجمہ: " اور سب سے بڑا حق کہ جسے اللہ سبحانہ نے فرض کیا ہے، وہ ہے حکمران کا حق رعیت پر اور رعیت کا حق حکمران پر، کہ جسے اللہ نے حکمران اور رعیت میں سے ہر ایک پر فرض کیا ہے۔ پس حکمران اور رعیت کے حق کو اس لیے بڑا قرار دیا ہے کہ اسے رابطہ محبت قائم کرنے اور ان کے دین کو سرفرازی بخشنے کا ذریعہ قرار دیا ہے۔"

القیم

اسی طرح حاکم کے لیے القیم کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام القیم کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

وَ مَكَانُ الْقَيِّمِ بِالْأَمْرِ مَكَانُ النِّظَامِ مِنَ الْخَرَزِ يَجْمَعُهُ وَ يَضُمُّهُ فَإِنِ انْقَطَعَ النِّظَامُ تَفَرَّقَ الْخَرَزُ وَ ذَهَبَ ثُمَّ لَمْ يَجْتَمِعْ بِحَذَافِيرِهِ أَبَداً۔ (5)

ترجمہ: "امورِ سلطنت میں حاکم کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو مہروں میں ڈورے کی جو کہ انہیں سمیٹ کر رکھتا ہے۔ جب ڈورا ٹوٹ جائے تو سب مہرے بکھر جاتے ہیں اور پھر کبھی سمٹ نہیں سکتے۔"

اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ مفتی جعفر حسین لکھتے ہیں:۔" حضرت کا ارشاد ہے کہ حاکم کی حیثیت ایک محور کی ہوتی ہے جس کے گرد نظام مملکت گھومتا ہے، ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی خاص شخصیت کے متعلق نہیں ہے۔ چنانچہ حکمران مسلمان ہو یا کافر، عادل ہو یا ظالم، نیک عمل ہو یا بد کردار مملکت کے نظم و نسق کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔" (6)

ولی امر

ولی امر، یعنی اس کام کا ذمہ دار، کلمۂ متصدی میں کسی قسم کی برتری کا مفہوم نہیں پایا جاتا ہے۔ اسلام سماج ایک عظیم کارخانہ کے مانند ہے کہ جو کئی حصّوں، مشینوں، اسکروؤں اور بولٹوں اور چھوٹے بڑے پرتا شیر

اور کم تاثیر حصّوں سے وجود میں آیا ہے، اس کے حصوں میں اس کا ایک حصہ، وہ حصہ ہے جس کو معاشرے کا حاکم تشکیل دیتا ہے، جو دوسرے تمام حصوں کے مانند ہے۔وہ بھی دوسرے باقی اجزاء اور عناصر کے مانند اس مجموعہ کو تشکیل دینے والا ہے، ولی امر اس کام کا متصدی (ذمہ دار) ہے۔

اس کام کا متصدی کسی قسم کی برتری کا طالب نہیں ہے اور نہ اس کی توقع رکھتا ہے۔اس کی وضع زندگی میں عملی اعتبار سے کسی قسم کی برتری اور مادی چیزیں اس سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، اگر وہ اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح نبھا سکتا ہے اس ذمہ داری کی انجام دہی کی وجہ سے معنوی مقدار میں اس کے معنوی حیثیت کو جلب کرے گی اتنی ہی مقدار میں اپنی حیثیت کسب کرے گا۔نہ اس سے کم نہ اس سے زیادہ، نہج البلاغہ میں یہی حکومت کا مفہوم ہے۔اس تعبیر کی بناء پر نہج البلاغہ میں حکومت کے (معنی) میں سلطہ گری کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے۔برتری طلبی کا کوئی بہانہ نہیں پایا جاتا دوسری طرف نہج البلاغہ کی تعبیر میں عوام کو رعایا سے یاد کیا گیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

فَلَيْسَتْ تَصْلُحُ الرَّعِيَّةُ إِلَّا بِصَلَاحِ الْوُلَاةِ وَلَا تَصْلُحُ الْوُلَاةُ إِلَّا بِاسْتِقَامَةِ الرَّعِيَّةِ۔ (7)

ترجمہ: "پس رعیت کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکام صالح نہ ہو اور حکام بھی اسی وقت اصلاح سے آراستہ ہو سکتے ہیں جب رعیت ان کے احکام کی انجام دہی کے لیے آمادہ ہو۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر آپؑ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَتَى كُنْتُمْ يَا مُعَاوِيَةُ سَاسَةَ الرَّعِيَّةِ وَوُلَاةَ أَمْرِ الْأُمَّةِ بِغَيْرِ قَدَمٍ سَابِقٍ وَلَا شَرَفٍ سَابِقٍ۔ (8)

ترجمہ: "اے معاویہ بھلا تم لوگ کب رعیت پر حکمرانی کی صلاحیت رکھتے تھے اور کب امت کے والی و سرپرست تھے؟ بغیر کسی پیش قدمی اور بغیر کسی بلند عزت و منزلت کے۔"

حکومت کے لیے درج ذیل الفاظ کا استعمال ہوا ہے

حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) نہج البلاغہ کے اہم حصوں میں حکومت کے حدود کی طرف اشارہ کرتے ہیں، شاید نہج البلاغہ میں دسیوں جملوں کی طرف نشاندہی کی جا سکتی ہے۔جو حضرت امام علی (علیہ السلام) کی نظر میں حکومت کے معنی و مفہوم کو مشخص کرتے ہیں منجملہ مالک اشتر کے خط کی ابتداء میں پڑھتے ہیں:

جِبَايَةَ خَرَاجِهَا وَ جِهَادَ عَدُوِّهَا وَ اسْتِصْلَاحَ أَهْلِهَا وَ عِمَارَةَ بِلَادِهَا۔ (9)

ترجمہ: "تاکہ وہاں کی ہم مالیات کو جمع کریں، اور ان کے دشمنوں سے جنگ کریں، اور وہاں کے باشندوں کے حالات کی اصلاح کریں، وہاں کے شہروں کو آباد کریں۔"

یہ حکومت کا معنی و مفہوم ہے۔ اگر مالک اشتر عصر کے حاکم اور والی اور گورنر کے عنوان سے معین ہوتے ہیں یہ اس لئے نہیں ہے کہ اپنے لئے کوئی عنوان یا کوئی اقتدار حاصل کریں یا کوئی مادی فائدہ سے بہرہ مند ہوں، بلکہ اس لئے ہے وہ اس کام کو ملک کو چلانے کے لئے انجام دیں ان سے مالیات لیں، عوام کے دشمنوں سے مبارزہ کریں، ان کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھیں ان کو صلاح سے قریب کریں (اس صلاح کا بھی ایک وسیع مفہوم ہے جو مادی اور معنوی دونوں کو شامل ہے۔

جو حضرت امام علی (علیہ السلام) کے نظریہ کے مطابق نہج البلاغہ کی منطق میں پیش کیا گیا ہے)۔ شہروں اور اپنی حکومت کے حدود کو آباد کریں، یعنی خلاصہ کے طور پر، انسانوں کو (انسان) بنائیں، زمین کو آباد کریں اخلاق اور معنوی اقدار کو ترقی دیں، لوگوں کی ذمہ داریوں اور جو کچھ حکومت کے بارے میں ان کی گردن پر ہے، اس کا نفاذ کرے۔

الامرۃ اور الامر

أَمَّا الْإِمْرَةُ الْبَرَّةُ فَيَعْمَلُ فِيهَا التَّقِيُّ وَ أَمَّا الْإِمْرَةُ الْفَاجِرَةُ فَيَتَمَتَّعُ فِيهَا الشَّقِيُّ إِلَى أَنْ تَنْقَطِعَ مُدَّتُهُ وَ تُدْرِكَهُ مَنِيَّتُهُ۔ (10)

ترجمہ: "اگر حکومت نیک اور صالح ہو گی تو اس میں متقی و پرہیزگار انسان اچھے اعمال کرتا ہے۔ اگر حکومت فاجر ہو گی تو اس میں بدبخت لوگ جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کا زمانہ ختم ہو جائے اور موت انہیں پالے۔"

ان دونوں الفاظ کی مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ أَحَقَّ النَّاسِ بِهَذَا الْأَمْرِ أَقْوَاهُمْ عَلَيْهِ وَ أَعْلَمُهُمْ بِأَمْرِ اللهِ فِيهِ۔ (11)

ترجمہ: "اے لوگو! تمام لوگوں میں اس حکومت و خلافت کا اہل وہ ہے، جو اس کو چلانے کی سب سے زیادہ قوت رکھتا ہو۔"

عوام کے لیے استعمال کئے گئے الفاظ

الرعیۃ اور الامۃ

نہج البلاغہ میں "الرعیۃ" کا لفظ 23 مرتبہ استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ عوام کے معانی میں زیادہ استعمال ہوا ہے کیونکہ رعیۃ کا لفظ بیشتر مقامات پر والی کے بعد استعمال ہوا ہے۔اسی طرح "الامۃ" کا لفظ 26 مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

الرعیۃ: وہ افراد جن کی حفاظت، نگرانی اور دیکھ بھال کی ذمہ داری والی کے کاندھے پر ہے۔یہ نگرانی اور حفاظت کبھی کبھی بے جان چیز کی کی جاتی ہے۔اس کا ایک الگ مفہوم اور معنی ہے کبھی کبھی یہ حفاظت و نگرانی کسی جاندار چیز سے مربوط ہے تو اس کا ایک الگ مفہوم ہے۔کبھی کبھی یہ حفاظت اور نگرانی کا تعلق انسانوں سے ہے یعنی انسان اپنی شخصیت کے تمام پہلوکے ساتھ آزاد خواہی کے ساتھ اپنی معنوی افزائش طلبی کے ساتھ، اپنے ارمان واہداف کے ساتھ، ان تمام کو ایک مجموعہ کے عنوان سے نظر میں رکھے، انسانوں کو ان تمام مجموعہ کے ساتھ مورد رعایت قرار دے۔

یہ وہی چیز ہے جس کی اسلامی تہذیب میں ہمیشہ لحاظ کیا گیا ہے۔اس بارے میں کمیت اسدی فرماتے ہیں: ''ساست لاکمن یرعی الناس سواء ورعیۃ الانعام''وہ سیاست مدار جو انسانوں کی مراعات کو حیوانوں کی مراعات کے مانند نہیں سمجھتے، یعنی انسان کو ان کی انسانیت کے ساتھ مراعات کی جانی چاہیئے، نہج البلاغہ کی تعبیر میں رعایا اور عوام کی تعبیر کا یہی معنی و مفہوم ہے، خلاصہ کے طور پر جب کہ ہم نہج البلاغہ میں حکومت کے معنی و مفہوم کی تلاش میں ہیں تو ایک طرف سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو حکومت کے سب سے پہلے عہدے پر ہے، والی ہے، ولی امر ہے، جو لوگوں کے امور کا ذمہ دار ہے اہم فریضہ کا مکلّف اور عہدہ دار ہے وہ انسان ہے جس کے کاندھے پر بڑی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔

لیکن دوسری طرف، عوام ہے جن کو ان کی تمام اقتدار کے ساتھ تمام حسرتوں کے ساتھ، ان کی تمام شخصیت کو تشکیل دینے والے عناصر کے ساتھ مراعات کیا جائے ان (نہج البلاغہ میں) حکومت کا جو معنی و مفہوم ہے اس مفہوم میں کسی سلطہ گری کا تصور ہے نہ زور وزبردستی کا اور نہ زیادہ خواہی کا۔ حضرت علی علیہ السلام رعیت کے طبقات یوں بیان کرتے ہیں:

اعْلَمْ أَنَّ الرَّعِيَّةَ طَبَقَاتٌ لَا يَصْلُحُ بَعْضُهَا إِلَّا بِبَعْضٍ وَ لَا غِنَى بِبَعْضِهَا عَنْ بَعْضٍ فَمِنْهَا جُنُودُ اللهِ وَ مِنْهَا كُتَّابُ الْعَامَّةِ وَ الْخَاصَّةِ وَ مِنْهَا قُضَاةُ الْعَدْلِ وَ مِنْهَا عُمَّالُ الْإِنْصَافِ وَ الرِّفْقِ وَ مِنْهَا أَهْلُ الْجِزْيَةِ وَ الْخَرَاجِ مِنْ أَهْلِ الذِّمَّةِ وَ مُسْلِمَةِ النَّاسِ وَ مِنْهَا التُّجَّارُ وَ أَهْلُ الصِّنَاعَاتِ وَ مِنْهَا الطَّبَقَةُ السُّفْلَى مِنْ ذَوِي الْحَاجَةِ وَ الْمَسْكَنَةِ وَ كُلٌّ قَدْ سَمَّى اللهُ لَهُ سَهْمَهُ وَ وَضَعَ عَلَى حَدِّهِ فَرِيضَةً فِي كِتَابِهِ أَوْ سُنَّةِ نَبِيِّهِ ص عَهْداً مِنْهُ عِنْدَنَا مَحْفُوظاً۔ (12)

ترجمہ: "اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ رعیت و عوام میں کئی طبقات ہیں، جن کی فلاح و بہبود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں کام آنے والے فوجیوں کا ہے، دوسرا طبقہ وہ جو عمومی اور خصوصی تحریروں کا کام انجام دیتا ہے، تیسرا طبقہ انصاف کرنے والے قاضی اور جج ہیں، چوتھا طبقہ حکومت کے وہ عمال ہیں جن سے امن اور انصاف قائم ہوتا ہے، پانچواں طبقہ جزیہ اور خراج دینے والے لوگوں کا ہے چاہے وہ غیر مسلم ذمی ہوں یا مسلمان ہوں، چھٹا طبقہ تاجروں اور صنعتگروں کا ہے، ساتواں طبقہ سب سے پست اور حاجتمند فقیروں اور مسکینوں کا ہے۔ اللہ نے ہر ایک کا حق متعین کر دیا ہے اور اپنی کتاب یا سنت نبوی ﷺ میں اس کی حد بندی کر دی ہے اور وہ مکمل دستور ہمارے پاس موجود ہے۔"

حضرت علی علیہ السلام حکومت کا عوام کے ساتھ بہترین طریقے سے پیش آنے کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

فَإِنَّهُمْ صِنْفَانِ إِمَّا أَخٌ لَكَ فِي الدِّينِ وَ إِمَّا نَظِيرٌ لَكَ فِي الْخَلْقِ يَفْرُطُ مِنْهُمُ الزَّلَلُ وَ تَعْرِضُ لَهُمُ الْعِلَلُ وَ يُؤْتَى عَلَى أَيْدِيهِمْ فِي الْعَمْدِ وَ الْخَطَإِ فَأَعْطِهِمْ مِنْ عَفْوِكَ وَ صَفْحِكَ مِثْلِ الَّذِي تُحِبُّ وَ تَرْضَى أَنْ يُعْطِيَكَ اللهُ مِنْ عَفْوِهِ وَ صَفْحِهِ فَإِنَّكَ فَوْقَهُمْ وَ وَالِي الْأَمْرِ عَلَيْكَ فَوْقَكَ وَ اللهُ فَوْقَ مَنْ وَلَّاكَ وَ قَدِ اسْتَكْفَاكَ أَمْرَهُمْ۔ (13)

ترجمہ: "عوام میں دو قسم کے لوگ ہیں یا تو تمہارے دینی بھائی ہیں یا تمہاری جیسی مخلوق جو اقلیتی غیر مسلم ہیں۔ ان سے لغزشیں بھی ہونگی اور خطاؤں سے بھی انہیں سابقہ پڑے گا اور ان

کے ہاتھوں سے عمداً یا سہواً غلطیاں بھی ہوں گی تم ان سے اسی طرح عفو و درگذر سے کام لینا جس طرح اللہ سے اپنے لیے عفو و درگذر کو پسند کرتے ہو۔"

اسی طرح عوام کے ساتھ عدل وانصاف کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ أَفْضَلَ قُرَّةِ عَيْنِ الْوُلَاةِ اسْتِقَامَةُ الْعَدْلِ فِي الْبِلَادِ وَ ظُهُورُ مَوَدَّةِ الرَّعِيَّةِ وَإِنَّهُ لَا تَظْهَرُ مَوَدَّتُهُمْ إِلَّا بِسَلَامَةِ صُدُورِهِمْ وَ لَا تَصِحُّ نَصِيحَتُهُمْ إِلَّا بِحِيطَتِهِمْ عَلَى وُلَاةِ الْأُمُورِ وَ قِلَّةِ اسْتِثْقَالِ دُوَلِهِمْ وَ تَرْكِ اسْتِبْطَاءِ انْقِطَاعِ مُدَّتِهِمْ۔ (14)

ترجمہ: "بے شک حکمرانوں کے لیے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل اور انصاف برقرار رہے اور رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے۔ ان کی محبت اس وقت ظاہر ہوا کرتی ہے کہ جب ان کے دلوں میں میل نہ ہو۔ اور ان کی خیر خواہی اسی صورت ثابت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لیے گھیرا ڈالے رہیں۔ ان کا اقتدار سر پر پڑا بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمے کے لیے گھڑیاں گنتے رہیں۔"

حکومت کی ضرورت

یہ خود ایک بحث ہے کہ کیا ایک انسانی سماج کے لئے حاکم وحکومت کا وجود ضروری چیز ہے یا نہیں؟ اس بحث سے نتیجہ اخذ کرنا اجتماعی وسماجی زندگی میں ضروریات سے ملتزم ہونے کے معنی میں ہے اور صرف اس بات میں منحصر نہیں ہے کہ ہم تسلیم کریں کہ سماج کے لئے حکومت ضروری ہے بلکہ ہماری بحث کا نتیجہ حاکمیت اور فرمانبرداری کی راہ وروش میں اور سماج کے چلانے میں بھی مخصوص مشخصات وخطوط کھینچے گا۔

حضرت علی علیہ السلام نے جب خوارج کا قول لاحکم الّا للہ سنا تو ان کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے:

كَلِمَةُ حَقٍّ يُرَادُ بِهَا بَاطِلٌ نَعَمْ إِنَّهُ لَا حُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ وَ لَكِنَّ هَؤُلَاءِ يَقُولُونَ لَا إِمْرَةَ إِلَّا لِلَّهِ وَإِنَّهُ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ أَمِيرٍ بَرٍّ أَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِي إِمْرَتِهِ الْمُؤْمِنُ وَ يَسْتَمْتِعُ فِيهَا الْكَافِرُ وَ يُبَلِّغُ اللَّهُ فِيهَا الْأَجَلَ وَ يُجْمَعُ بِهِ الْفَيْءُ وَ يُقَاتَلُ بِهِ الْعَدُوُّ وَ تَأْمَنُ بِهِ السُّبُلُ وَ يُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوِيِّ حَتَّى يَسْتَرِيحَ بَرٌّ وَ يُسْتَرَاحَ مِنْ فَاجِرٍ۔ (15)

یہ جملہ تو صحیح ہے مگر جو مطلب وہ لیتے ہیں وہ غلط ہے۔ ہاں بے شک حکم اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ مگر یہ لوگ تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حکومت بھی اللہ کے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ لوگوں کے لیے ایک حاکم کا ہونا ضروری خواہ وہ اچھا ہو یا برا ہو۔

نہج البلاغہ میں یہ بحث ایک خاص گروہ کے مقابلہ میں پیش کی جاتی ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے۔ایک سماج میں ہمیشہ قدرت مندانہ رجحان ایسے افراد میں پایا جاتا ہے، جو سماج میں اپنی ایک حیثیت اور مقام بنانا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے لئے سماج کی عمومی روال کو نہیں مانتے وہ اپنے کو اجتماعی زندگی کی ضروریات سے ،جو انسانوں کے کاندھے پر رکھی جاتی ہے آزاد رکھنا چاہتے ہیں وہ اجتماعی اور سماجی عہد و پیمان کو توڑ دیتے ہیں۔

یہ رجحان ہمیشہ انسانی سماج میں پایا جاتا رہا ہے اور آج بھی ہے آئندہ بھی رہے گا جب تک کہ انسانی اخلاقی کمال کی منزل تک نہیں پہنچے گا۔ان کی مثال ان لوگوں جیسی ہے، جو کسی کشتی میں سوار ہوں اور اس میں سوراخ کر دیں یا وہ ایک ٹرین میں سوار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ وہ جس ڈبہ میں سوار ہیں یا وہ جس کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں، وہ ان کو ایسی جگہ اتار دے جو ان کی نظر میں آب و ہوا کے اعتبار سے بڑی اچھی جگہ ہے اور اگر ضروری ہو تو پوری گاڑی رک جائے ، اس پر ان کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ ایک اجتماعی زندگی کی ضروریات ،جو انسان پر تحمیل کی جاتی ہے ان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ اگر سماج میں یہ جابرانہ رجحان پھلنے اور پھولنے کا موقع پا جائے ، تو اس کا نتیجہ افراتفری کا ہو جائے گا۔

حضرت امام علی (علیہ السلام) اس رجحان کے رکھنے والوں کے بارے میں فرماتے ہیں : "لابدّ للنّاس من امیر" 3 "لوگوں کے لئے اور حاکم ہونا ضروری ہے۔"حضرت امام علی (علیہ السلام) یہ جملہ ایک خاص گروہ کے بارے میں فرمارہے ہیں جو حکومت کی ضرورت کا منکر تھا اور اگر باطنی طور پر ریاست طلبی کے رجحان سے قدرت و طاقت کی طرف جھکاؤ پیدا ہوتا ہے لیکن ظاہری طور پر اس جذبے کے اوپر کسی فلسفہ کی رونق پائی جاتی ہے تو یہ وہی چیز ہے جس کا ہمیں عصر امیر المومنین (علیہ السلام) میں سراغ ملتا ہے۔

خوارج میں کچھ سچ لیکن اشتباہ تھا اور کچھ کچھ ایک غرض کے تحت کہہ رہے تھے :لاحکم الّا للہ یعنی "ہمیں سماج اور معاشرے میں حکومت کی ضرورت نہیں ہے۔" حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) اس جملہ لا حکم الّا للہ کے معنی کو بیان کرتے ہیں اور ان کی غلطی کی وضاحت کر رہے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں آتا خوارج

کا سردار اشعث بن قیس غلطی کر رہا تھا ہمیں یہ بھی یقین نہیں آتا کہ حضرت امام علی (علیہ السلام) کے موذی سیاست مدار رقیب اس رجحان کے ایجاد کرنے میں بظاہر الٰہی اور توحیدی نقش نہیں رکھتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں حکومت خدا سے مخصوص ہے ہمیں حکومت نہیں چاہیئے اگر اس دن امام علی علیہ السلام اس مغالطہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے یا ان لوگوں کے اجتماعی ہیجان کے سامنے، جو اپنی سادہ دلی کی وجہ سے اس کلمۂ باطل کو قبول کر چکے تھے، سر تسلیم خم کر دیتے اور معزول ہو جاتے تو اس وقت وہی لوگ جو کہہ رہے تھے ہمیں حکومت کی ضرورت نہیں ہے حکومت کے دعویدار بن جاتے اور وارد میدان ہو جاتے۔

حضرت امام علی (علیہ السلام) فرماتے ہیں: نہیں، "لابد للناس من امام "سماج میں حکومت ضروری ہے۔ اور وہ لوگ جق بات کہہ رہیں وہ "کلمة حق یراد بها الباطل " بات حق کہہ رہے ہیں، لیکن اس سے باطل ارادہ کر رہے ہیں حقیقت میں یہ بات قرآن کریم کی ہے: "انّ الحکم الاّ للّٰہ" حکم و حکومت کا حق صرف خدا کو ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سماج کو حاکم اور حکومت کی ضرورت نہیں ہے: "نعم انّه لاحکم الا للّٰہ ولکن هؤلاء یقولون لا امرة الا للّٰہ" خوارج کہنا چاہتے ہیں کہ خود خدا سماج کو چلائے خدا کے علاوہ کسی کو سماج کو چلانے کا حق حاصل نہیں ہے، یعنی سماج کو کوئی انسان چلانے والا نہ رہے اس کو کسی حاکم کی ضرورت نہیں ہے۔

حکومت کے لئے حاکم کا ہونا ایک اجتماعی، فطری اور انسانی ضرورت ہے، سماج کو ایک حاکم کی ضرورت ہے انسانوں کی ضروریات زندگی کا تقاضہ ہے کہ حاکم پایا جائے، یہ جو کلمۂ لاحکم الاّ للّٰہ کہہ رہے تھے اس سے در حقیقت حضرت امام علی علیہ السلام کی حکومت کا انکار کر رہے تھے جس سے وہ ناخوش تھے در حالیکہ یہ جملہ لاحکم الاّ للّٰہ خدا کے شریک کی نفی کر رہا ہے، خدا کے قریب کی حاکمیت کی نفی اور انکار کر رہا ہے، وہ حاکمیت جو خدا کی حاکمیت کے مقابل میں ہو، حضرت امام علی (علیہ السلام) کی حاکمیت خدا کے مقابل میں نہیں تھی بلکہ خدا کی حاکمیت کے زیر سایہ تھی جس کا سرچشمہ حکومتِ خدا تھی۔

حضرت امام علی (علیہ السلام) اس مسئلہ کو واضح کر رہے ہیں کہ اگر کسی سماج میں ایسی حکومت جس کا منشأ حاکمیت خدا ہو پائی جائے اس وقت جو بھی لاحکم الاّ للّٰہ کے مفہوم کے برخلاف دکھائی دے وہ تحریک خدائی اور علوی تحریک کے برخلاف ہو گی۔ حضرت امام علی (علیہ السلام) اس تحریک سے بڑی قاطعیت

کے ساتھ پیش آئے اور وہ خوارج جو راہ حق سے پھر گئے تھے اور اس کی طرف واپس نہیں آرہے تھے ان کا قلعہ قمع کردیا۔

حکومت کی اہمیت

اگر حکومت نیک اور صالح ہو گی تو اس میں متقی انسان کو نیک اور صالح اعمال بجالانے کی آزادی ہو گی جس کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :

امّا الامرۃُ البرّۃُ فیعملُ فیھاالتَّقیُّ۔ امّا الامرۃُ الفاجِرۃُ فَیَتَمَتَّعُ فیھا الشَّقیُّ الیٰ ان تنقطِعَ مُدّتُہُ وتُدرِکَہُ مَنِیَّتُہُ۔ (16)

ترجمہ: "اگر حکومت نیک اور صالح ہو گی تو اس میں متقی و پرہیزگار انسان اچھے اعمال کرتا ہے۔اگر حکومت فاجر ہو گی تو اس میں بدبخت لوگ جی بھر کر لطف اندوز ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کازمانہ ختم ہوجائے اور موت انہیں پالے۔"

اس خطبے میں امام علی علیہ السلام اس اہم نکتے کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ امارت و حکومت کے درمیان کیا فرق ہے ؟ حاکمیت مطلقہ تو صرف اللہ تعالی کے لیے ہے قانون اور اس کا نفاذ، امر و نہی اور معاشرے کی کلی سیاست کی تشکیل دراصل اللہ کی رضا اور اس کے حکم سے ہونی چاہیے لیکن امارت جو سربراہی، رہبری اور سرپرستی کے سوا کچھ نہیں۔ یہ ایسی چیز ہے جو اللہ کے بندوں کے سپرد کی گئی ہے اور کوئی معاشرہ اس سے بے نیاز نہیں ہے۔ بہرحال اگر معاشرہ صالح ہوگا تو صالح اور صحیح حاکمیت کو قبول کرے گا، اور اگر غیر صالح ہو گا اور رہبری کی تشخیص اس میں نہ ہو گی تو یہی امر، ظالم اور غیر صالح افراد کے تسلط کا باعث بن جائے گا۔

بہر حال حضرت علی علیہ السلام کے نظریہ کی روشنی میں بنیادی طور پر حاکمیت و رہبری کی ضرورت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پس کوئی بھی معاشرہ بغیر رہبر اور حاکم کے اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ چاہے وہ صالح اور قانونی ہو یا غیر صالح اور غیر قانونی ہو۔ کیونکہ اسی حاکم کے ذریعے امن اور امان قائم رہتا ہے، عدل اور انصاف قائم ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنا حق ملتا ہے اور ہر ایک کو عمل کی آزادی ملتی ہے چاہے وہ مؤمن ہو یا شقی اور بدبخت ہو یا کافر ہو۔ کیونکہ اگر کوئی بھی حاکم نہ ہو تو اس وقت فتنہ اور

فساد بڑھ جائے گا اور معاشرے کا امن اور امان تباہ و برباد ہو جائے گا لہٰذا ہر صورت میں ایک حاکم کا ہونا ضروری ہے جو اس فتنہ اور فساد کو روک سکے۔

إِنَّهُ لَيْسَ عَلَى الْإِمَامِ إِلَّا مَا حُمِّلَ مِنْ أَمْرِ رَبِّهِ الْإِبْلَاغُ فِي الْمَوْعِظَةِ وَ الِاجْتِهَادُ فِي النَّصِيحَةِ وَ الْإِحْيَاءُ لِلسُّنَّةِ وَإِقَامَةُ الْحُدُودِ عَلَى مُسْتَحِقِّيهَا وَإِصْدَارُ السُّهْمَانِ عَلَى أَهْلِهَا۔ (17)

ترجمہ: "امام کا فرض تو بس یہ ہے کہ جو کام اسے اپنے پروردگار کی طرف سے سپرد ہوا ہے اسے انجام دے اور وہ یہ ہے کہ وعظ و نصیحت کی باتیں ان تک پہنچائے۔ اور انہیں نصیحت کرنے میں پوری پوری کوشش کرے۔ سنت کو زندہ رکھے۔ جن پر حد لاگو ہوتی ہے ان پر حد جاری کرے اور حصوں کو ان کے اصلی وارثوں تک پہنچائے۔"

اسی طرح جب حضرت علی علیہ السلام نے حضرت مالک اشتر کو جب مصر کا گورنر بنا کر بھیجا تو اسے فرمایا:

جِبَايَةَ خَرَاجِهَا وَ جِهَادَ عَدُوِّهَا وَ اسْتِصْلَاحَ أَهْلِهَا وَ عِمَارَةَ بِلَادِهَا۔ (18)

ترجمہ: "وہ خراج جمع کریں، دشمنوں سے جہاد کریں، رعایا کی فلاح و بہبود کا انتظام کریں اور شہروں کی آبادی کا انتظام کریں۔"

حاکم اپنے آپ کو اپنی عوام کے غریب فرد کی زندگی پر رکھے

حضرت علی علیہ السلام حکام کو ہدایت کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّ اللهَ تَعَالَى فَرَضَ عَلَى أَئِمَّةِ الْعَدْلِ أَنْ يُقَدِّرُوا أَنْفُسَهُمْ بِضَعَفَةِ النَّاسِ كَيْلَا يَتَبَيَّغَ بِالْفَقِيرِ فَقْرُهُ۔ (19)

ترجمہ: "اللہ نے عادل اماموں پر فرض کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مفلس و نادار لوگوں کی سطح پر رکھیں تاکہ فقیر لوگ اپنے فقر کی وجہ سے پیچ و تاب نہ کھائے۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں:

وَ لَوْ شِئْتُ لَاهْتَدَيْتُ الطَّرِيقَ إِلَى مُصَفَّى هَذَا الْعَسَلِ وَ لُبَابِ هَذَا الْقَمْحِ وَ نَسَائِجِ هَذَا الْقَزِّ وَ لَكِنْ هَيْهَاتَ أَنْ يَغْلِبَنِي هَوَايَ وَ يَقُودَنِي جَشَعِي إِلَى تَخَيُّرِ الْأَطْعِمَةِ وَ لَعَلَّ بِالْحِجَازِ أَوْ الْيَمَامَةِ مَنْ لَا طَمَعَ لَهُ فِي الْقُرْصِ وَ لَا عَهْدَ لَهُ بِالشِّبَعِ أَوْ أَبِيتَ مِبْطَاناً وَ حَوْلِي بُطُونٌ غَرْثَى وَ أَكْبَادٌ حَرَّى أَ أَقْنَعُ مِنْ

نَفْسِی بِأَنْ یُقَالَ هَذَا أَمِیرُ الْمُؤْمِنِینَ وَ لَا أُشَارِکُهُمْ فِی مَکَارِهِ الدَّهْرِ أَوْ أَکُونَ أُسْوَةً لَهُمْ فِی جُشُوبَةِ الْعَیْشِ۔ (20)

ترجمہ: "اگر میں چاہتا تو صاف ستھرے شہد، عمدہ گیہوں اور ریشم کے بنے ہوئے کپڑوں کے لیے ذرائع مہیا کر سکتا تھا۔ ایسا کہاں ہو سکتا ہے کہ خواہشیں مجھے مغلوب بنالیں اور حرص مجھے اچھے اچھے کھانوں کے چن لینے کی دعوت دے۔ حجاز و یمامہ میں شاید ایسے بھی لوگ ہوں کہ جنہیں ایک روٹی کے ملنے کی بھی آس نہ ہو، اور انہیں پیٹ بھر کھانا کبھی نصیب نہ ہوا ہو۔ کیا میں اپنا پیٹ بھر کر سویا رہوں اس حالت میں کہ میرے گرد بھوکے اور پیاسے جگر تڑپتے ہوں۔ کیا میں اسی میں مگن رہوں کہ مجھے امیر المؤمنین کہا جاتا ہے؟ مگر میں زمانے کی سختیوں میں مؤمنوں کا شریک نہ بنوں اور زندگی کی بدمزگیوں میں ان کے لیے نمونہ نہ بنوں۔"

حاکم کے آنکھوں کی ٹھنڈک

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ أَفْضَلَ قُرَّةِ عَیْنِ الْوُلَاةِ اسْتِقَامَةُ الْعَدْلِ فِی الْبِلَادِ وَ ظُهُورُ مَوَدَّةِ الرَّعِیَّةِ وَ إِنَّهُ لَا تَظْهَرُ مَوَدَّتُهُمْ إِلَّا بِسَلَامَةِ صُدُورِهِمْ وَ لَا تَصِحُّ نَصِیحَتُهُمْ إِلَّا بِحِیطَتِهِمْ عَلَى وُلَاةِ الْأُمُورِ وَ قِلَّةِ اسْتِثْقَالِ دُوَلِهِمْ وَ تَرْکِ اسْتِبْطَاءِ انْقِطَاعِ مُدَّتِهِمْ۔ (21)

ترجمہ: "بے شک حکمرانوں کے لیے سب سے بڑی آنکھوں کی ٹھنڈک اس میں ہے کہ شہروں میں عدل اور انصاف برقرار رہے اور رعایا کی محبت ظاہر ہوتی رہے۔ ان کی محبت اس وقت ظاہر ہوا کرتی ہے کہ جب ان کے دلوں میں میل نہ ہو۔ اور ان کی خیر خواہی اسی صورت ثابت ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے حکمرانوں کے گرد حفاظت کے لیے گھیرا ڈالے رہیں۔ ان کا اقتدار سر پر پڑا بوجھ نہ سمجھیں اور نہ ان کی حکومت کے خاتمے کے لیے گھڑیاں گنتے رہیں۔"

حکومت حق ہے یا فریضہ؟

مسئلہ یہ ہے کہ: کیا حکومت کرنا ایک حق ہے یا ایک ذمہ داری ہے؟ حاکم کو حکومت کرنے کا حق ہے یا اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ حکومت کرے؟ کون سا انسان حکومت کر سکتا ہے؟ یا کس انسان کو حکومت کرنی چاہیئے؟ نہج البلاغہ کی نظر میں حکومت حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی ہے لیکن اس شخص کے لئے جو حکومت کے شرائط اور معیار کا حامل ہو، ذمہ داری اس صورت میں ہے کہ حکومت کو قبول کرے وہ اس ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ حکومت مقصد ہے یا وسیلہ؟ ایک شخص یا ایک گروہ کی حکومت مقصد ہے یا ایک وسیلہ ہے؟ اگر وسیلہ ہے تو کس ہدف کے لئے ہے؟ حاکم حکومت کے ذریعہ کس مقصد تک پہنچنا چاہتا ہے اور سماج کو اس منزل تک پہونچانا چاہتا ہے؟

دوسرا مسئلہ جس کی نہج البلاغہ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، وہ یہ ہے کہ کیا حکومت ایک حق ہے یا ایک فریضہ؟ حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) اپنے مختصر سے بیان میں حکومت کو حق بھی سمجھتے ہیں اور فریضہ بھی، لیکن اس طرح بھی نہیں ہے کہ جس شخص کے لئے بھی لوگوں کے امور کی سرپرستی کے شرائط فراہم ہوگئے اور کسی بھی طریقے سے اپنا پرچار کرکے، ان روش کو اختیار کرکے جس کو عام طور سے طالبانِ قدرت بہتر جانتے ہیں ان روش کو اختیار کرے اور عوام کی نظر کو جذب کرکے حکومت کر سکے۔

جب حکومت حق ہے تو یہ حق کچھ خاص افراد کا حق ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ طبقہ کوئی ممتاز طبقہ ہے۔ بلکہ اسلامی معاشرے میں ہر ایک کو یہ موقع دیا گیا ہے کہ وہ خود کو ان صفات سے آراستہ کرے ہر شخص ان شرائط کو حاصل کر سکتا ہے، لیکن زمانۂ پیغمبر (ﷺ) کے بعد ایک استثنائی دور تھا۔ نہج البلاغہ اپنے بیانات کو عمومی طور پر پیش کرتا ہے اور اس حق کی طرف بارہا اشارہ کرچکا ہے۔ حضرت امام علی (علیہ السلام) نے آغاز خلافت میں ایک خطبہ دیا ہے جس کو خطبۂ شقشقیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے آپؑ اس خطبہ میں فرماتے ہیں:

إِنَّهُ لَيَعْلَمُ أَنَّ مَحَلِّي مِنْهَا مَحَلُّ الْقُطْبِ مِنَ الرَّحَى يَنْحَدِرُ عَنِّي السَّيْلُ وَ لَا يَرْقَى إِلَيَّ الطَّيْرُ۔ (22)

ترجمہ: "خلافت میں میری مثال چکی کی اس کھوٹی کی طرح ہے جس کے بغیر چکی چل نہیں سکتی مجھ سے علوم و معارف کا چشمہ جاری ہے اور کوئی طائر فکر میری بلندی تک پرواز نہیں کر سکتا۔"

شوری کے وقت اہل شوری سے فرمایا:

لَقَدْ عَلِمْتُمْ أَنِّي أَحَقُّ النَّاسِ بِهَا مِنْ غَيْرِي۔ (23)

ترجمہ: "اے لوگو تم کو معلوم ہے کہ میں حکومت وخلافت کا سب سے زیادہ حقدار ہوں۔"

امام (علیہ السلام) نہج البلاغہ میں حکومت کو حق سمجھتے ہیں جس کو آپ نے واضح طور پر بیان کیا ہے اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں:

وَ وَاللهِ لَأُسْلِمَنَّ مَا سَلِمَتْ أُمُورُ الْمُسْلِمِينَ وَ لَمْ يَكُنْ فِيهَا جَوْرٌ إِلَّا عَلَيَّ خَاصَّةً۔ (24)

ترجمہ: "خدا کی قسم خلافت کو دوسرے کے حوالے کر دیتا ہوں جب تک مسلمانوں کے امور منظّم رہیں اور اس خلافت میں میری ذات کے علاوہ کسی اور پر ظلم نہ ہو جب تک فقط میری ذات پر ظلم ہوگا صبر کروں گا، سر تسلیم خم ہے۔ جب تک کام اپنے طریقے پر انجام ہوتا رہے گا میں حکومت کی خدمت کرنے میں مصروف رہوں گا۔"

رحلت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی اسی طرح فرمایا تھا:

فَأَمْسَكْتُ يَدِي حَتَّى رَأَيْتُ رَاجِعَةَ النَّاسِ قَدْ رَجَعَتْ عَنِ الْإِسْلَامِ يَدْعُونَ إِلَى مَحْقِ دِينِ مُحَمَّدٍ ﷺ فَخَشِيتُ إِنْ لَمْ أَنْصُرِ الْإِسْلَامَ وَ أَهْلَهُ أَنْ أَرَى فِيهِ ثَلْماً أَوْ هَدْماً تَكُونُ الْمُصِيبَةُ بِهِ عَلَيَّ أَعْظَمَ مِنْ فَوْتِ وِلَايَتِكُمُ الَّتِي إِنَّمَا هِيَ مَتَاعُ أَيَّامٍ قَلَائِلَ يَزُولُ مِنْهَا مَا كَانَ كَمَا يَزُولُ السَّرَابُ أَوْ كَمَا يَتَقَشَّعُ السَّحَابُ فَنَهَضْتُ فِي تِلْكَ الْأَحْدَاثِ حَتَّى زَاحَ الْبَاطِلُ وَ زَهَقَ وَ اطْمَأَنَّ الدِّينُ وَ تَنَهْنَهَ۔ (25)

ترجمہ: "تو میں نے اپنا ہاتھ روک دیا میں نے دیکھا کہ مرتد ہونے والے اسلام سے مرتد ہو کر دینِ محمد ﷺ کو مٹا ڈالنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اب میں ڈرا کہ اگر کوئی رخنہ یا خرابی دیکھتے ہوئے میں اسلام اور اہل اسلام کی مدد نہ کروں گا تو یہ میرے لیے اس سے بڑھ کر مصیبت ہو گی جتنی یہ کہ تمہاری حکومت میرے ہاتھ سے چلی جائے۔ حکومت تو تھوڑے دنوں کا اثاثہ ہے، اس میں موجود ہر چیز زائل ہو جائے گی، اس طرح جیسے سراب بے حقیقت ثابت ہوتا ہے یا جس طرح بدلی چھٹ جاتی ہے۔ چنانچہ میں ان بدعتوں کے ہجوم میں اٹھ کھڑا ہوا، یہاں تک کہ باطل دب کر فنا ہو گیا اور دین محفوظ ہو کر تباہی سے بچ گیا۔"

پہلے میں نے بیعت نہیں کی سر تسلیم خم نہیں کیا لیکن جب میں نے دیکھا کہ کچھ ایسے حوادث پیش آرہے ہیں کہ جب واقعات کی مصیبت اسلام و مسلمین اور خود امام علی (علیہ السلام) کے لئے، حق حکومت کے چھن جانے کی مصیبت سے زیادہ دشوار اور قابل تحمل نہیں ہے یہ کہ حضرت امام علی (علیہ السلام) حکومت کو ایک حق جانتے تھے قابل انکار نہیں ہے۔

بہتر ہے سارے مسلمان اس مسئلہ کو تعصب کا عینک اتار کر دیکھیں، یہ چیز سنّی اور شیعہ کے درمیان جھگڑا اور لڑائی سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، آج ہم اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں پوری کائنات میں شیعہ اور سنّی متحد ہو کر زندگی بسر کریں اور اسلامی بھائی چارگی کو ہر چیز سے زیادہ فوقیت دیں یہ ایک حقیقت ہے یہ تبادلۂ خیال اور اتحاد آج ایک فریضہ ہے اور ہمیشہ یہی ذمہ داری رہی ہے۔ نہج البلاغہ کی ایک علمی اور اعتقادی بحث ہمیں اس حقیقت کا پتہ دیتی ہے۔ ہم سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لیں اور جو کچھ نہج البلاغہ نے واضح طور پر کہا ہے اس سے چشم پوشی کر لیں اس حکومت کو حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) اپنا حق سمجھتے تھے اسی طرح اس کو ایک وظیفہ اور ذمہ داری بھی سمجھتے تھے۔ یعنی اس دن جب لوگ حضرت امام علی (علیہ السلام) کے گرد گرد جمع ہو گئے تھے۔

جیسا کہ خود فرماتے ہیں: "میرے دروازے پر لوگوں کا اتنا مجمع جمع ہو گیا تھا کہ میرے بیٹے حسن و حسین علیہم السلام لوگوں کے قدموں سے روندے جارہے تھے میری عبا پھٹ گئی تھی" علی (علیہ السلام) سے بڑی عاجزانہ طور سے خواہش کر رہے تھے کہ وہ ان کی درخواست کو قبول کر لیں اور ان کی حکومت کی باگ دوڑ سنبھال لیں، حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) کی نظر میں حکومت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کا ہدف حکومت نہیں ہے جس کو بعد کی بحث میں واضح ہو جانا چاہیئے، لیکن اس کے باوجود حکومت کو ایک وظیفہ کے طور پر قبول کر لیتے ہیں اور اس سے دفاع کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں:

لَوْلَا حُضُورُ الْحَاضِرِ وَ قِيَامُ الْحُجَّةِ بِوُجُودِ النَّاصِرِ وَ مَا أَخَذَ اللهُ عَلَى الْعُلَمَاءِ أَلَّا يُقَارُّوا عَلَى كِظَّةِ ظَالِمٍ وَلَا سَغَبِ مَظْلُومٍ لَأَلْقَيْتُ حَبْلَهَا عَلَى غَارِبِهَا وَلَسَقَيْتُ آخِرَهَا بِكَأْسِ أَوَّلِهَا-(26)

ترجمہ: "اگر لوگوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو چکی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پروری اور مظلوم کی بھوک

پر سکون وقرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر رکھ دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا۔"

اگر وہ لوگ بیعت کے لئے میرے پاس حاضر نہ ہوتے اور ناصر مل جانے سے حجت تمام نہ ہو جاتی یقیناً خلافت کے اونٹ کی مہار اس کے کوہان پر ڈال دیتا اور آخری خلافت کو اس کے پہلے جام سے سیراب کرتا۔ یعنی جس طرح میں نے پہلی بار اس کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا اس وقت بھی کوئی اقدام نہ کرتا پھر بھی میری نظر میں حکومت کی کوئی قدر نہیں ہے۔ میں مقام ومرتبہ کو حاصل کرنے کے لئے اقدار کو کھو دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اب بھی حاضر ہوں کہ پہلے جام سے ان بھاری مجمع کو سیراب کروں، جس طرح روز اول میں نے کنارہ کشی اختیار کی پھر بھی دوبارہ کنارہ کشی کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔ آپؑ اس مطلب کو تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دَعُونِی وَ الْتَمِسُوا غَیْرِی۔ (27)

ترجمہ: "مجھے چھوڑو کسی دوسرے کو اپنا ولی بناؤ۔"

لیکن امام علی (علیہ اسلام) جس وقت ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اور زمینہ آمادہ پاتے ہیں کہ وہ اس عظیم اور بنیادی ذمہ داری کا بیڑا اٹھا سکتے ہیں تو حکومت کو قبول کر لیتے ہیں۔ کیا حکومت حضرت امام علی (علیہ اسلام) کے لئے ہدف ہے یا وسیلہ؟ حضرت امام علی (علیہ السلام) اور دوسروں کی حکومت کے درمیان یہی بنیادی فرق ہے۔ حضرت امام علی (علیہ السلام) کے لئے حکومت ہدف نہیں بلکہ معنوی اقدار تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔

حوالہ جات

1 ۔ نہج البلاغہ خطبہ 103، صفحہ 239
2۔ نہج البلاغہ خطبہ، صفحہ خطبہ 162 ص339
3۔ نہج البلاغہ خطبہ 129، صفحہ 287
4۔ نہج البلاغہ خطبہ 214، صفحہ 465
5۔ نہج البلاغہ خطبہ 144، صفحہ 303
6۔ نہج البلاغہ، مترجم مفتی جعفر حسین، صفحہ 304
7۔ نہج البلاغہ خطبہ 214، صفحہ 465
8۔ نہج البلاغہ، مکتوب 10، صفحہ 509
9۔ نہج البلاغہ، مکتوب 53، صفحہ 581
10۔ نہج البلاغہ خطبہ 40، صفحہ 148
11۔ نہج البلاغہ خطبہ 171، صفحہ 355
12۔ نہج البلاغہ، مکتوب 53، صفحہ 587
13۔ نہج البلاغہ، مکتوب 53، صفحہ 582
14۔ نہج البلاغہ مکتوب 53، صفحہ 589
15۔ نہج البلاغہ خطبہ 40، صفحہ 148
16۔ نہج البلاغہ خطبہ 40، صفحہ 184
17۔ نہج البلاغہ طبہ 103، صفحہ 239
18۔ نہج البلاغہ، مکتوب 53، صفحہ 581
19۔ نہج البلاغہ خطبہ 207، صفحہ 451
20۔ نہج البلاغہ، مکتوب 45، صفحہ 568
21۔ نہج البلاغہ مکتوب 53، صفحہ 589
22۔ نہج البلاغہ خطبہ 3، صفحہ 72
23۔ نہج البلاغہ خطبہ 72، صفحہ 176
24۔ نہج البلاغہ خطبہ 72، صفحہ 176
25۔ نہج البلاغہ، مکتوب 62، صفحہ 609
26۔ نہج البلاغہ خطبہ 3، صفحہ 74
27۔ نہج البلاغہ خطبہ 90، صفحہ 220

اہلبیت علیہم السلام کی نظر میں
فہم قرآن کی مشکلات اور خطرات

علی محمد قاسمی*

ترجمہ: حجۃ الاسلام سید حسنین عباس گردیزی

کلیدی کلمات: اہل بیتؑ، فہم قرآن، تفسیر بالرائے، راسخون فی العلم، علامہ طباطبائی، فیض کاشانی، خصوصیات قرآن،

خلاصہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ آیات الٰہی کو سمجھنا سب کے لیے ممکن ہے اگرچہ دلالت کے لحاظ سے یا فہم قرآن میں صانی اور دشواری کے لحاظ سے مختلف مراتب ہیں۔ راسخون فی العلم (اہل بیتؑ) کے علاوہ ہر کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ قرآن کی گہرائیوں کو سمجھ سکے، اس کے بواطن کی تہہ تک پہنچ سکے یا اس کے تأویل سے آگاہ ہو سکے۔ ان بزرگ ہستیوں نے متعدد احادیث کے ذریعے جو ان سے نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں، لوگوں کو قرآن سے استفادہ کرنے دعوت دی ہے اس خدشے کے پیش نظر کہ مبادا لوگ کتاب الٰہی کو سمجھنے میں غلطی کا ارتکاب کریں، انہیں تفسیر بالرائے سے خبر دار کیا ہے اور دوسری طرف مختلف انداز اور الفاظ میں فہم قرآن کے بارے میں خطرات اور مشکلات سے آگاہ کیا ہے تاکہ ناخواستہ یا ندانستہ طور پر ایسے خطرات سے دوچار نہ ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں کلام الٰہی کو نہ خود صحیح طور پر سمجھ سکیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں۔ اس مقالے میں تفسیر بالرائے کے حوالے سے معصومین علیہم السلام نے جن باتوں اور خطرات سے خبر دار کیا ہے، انہیں بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

---

* ۔ ایرانی اسکالر

مقدمہ

جیساکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ "قرآنی آیات کے دلالت کے اعتبار سے عام فہم یا دشوار فہم ہونے کے لحاظ سے مختلف درجے ہیں ان میں بعض آیات بہت ہی واضح اور بدیہی ہیں چنانچہ سب لوگ ایسی آیات کو سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض دیگر آیات کو سمجھنا مطلب کی گہرائی، باطن اور تاؤیل تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ ان آیات کا علم اللہ تعالیٰ ،انبیاءؑ اور راسخون فی العلم کے پاس ہے۔اگر دوسرے ان آیات کی حقیقت اور ان کے معانی کی گہرائیوں کو تک پہنچنا چاہتے ہیں تو انہیں قرآن کے حقیقی مفسرین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ قرآن دو جلدوں کے درمیان لکھی ہوئی تحریر ہے اس کی زبان نہیں ہے کہ بول سکے لہٰذا اسے ایک ترجمان کی ضرورت ہے۔(1)

زیارت جامعہ کبیرہ میں آئمہ معصومینؑ کے لیے مذکورہ یہ جملہ "وتراجمة لوحيه"(2)اسی مطلب کو بیان کررہاہے۔

آیات قرآنی کی تیسری قسم کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کی زیادہ تر تعلیمات اور معارف اسی سے مختص ہیں انہیں وہ افراد سمجھ سکتے ہیں جو ذوق سخن پاک وصاف ذہن اور وسیع القلب کے مالک ہوتے ہیں۔(3)

اس الہی دستر خوان سے لوگ بہترین اور زیادہ سے زیادہ استفادہ کرسکیں اس مقصد کے لیے اہلبیت علیہم السلام نے ایک طرف تو لوگوں کو تفسیر بالرائے سے منع کیا ہے کیونکہ تفسیر بالرائے نہ فقط ہدایت نہیں کرتی جو کہ نقض غرض الہی ہے (کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے کہ لوگ ہدایت پائیں) بلکہ یہ گمراہ کن اور انسان کو فریب اور دھوکے میں ڈال دیتی ہے۔دوسری طرف ان خطرات اور نقصانات سے بھی ممکنہ حد تک اور مختلف الفاظ میں خبر دار کیا ہے جو آیات الہی کو سمجھنے میں انسان کے لیے رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ان دونوں چیزوں کو مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید کی مناسب اور شائستہ تفسیر اور تشریح کی جائے کیونکہ قرآن کی تفسیر ان خطرات اور نقصانات کو مد نظر رکھے بغیر در حقیقت وہی تفسیر بالرائے ہی ہوگی۔

تفسیر بالرائے

تفسیر قرآن میں ہر چیز سے زیادہ جس بات سے اہلبیت علیہم السلام نے منع فرمایا ہے، وہ تفسیر بالرائے ہے۔ جس کا سرچشمہ انحرافی افکار، نفسانی خواہشات کی پیروی اور ذاتی رجحانات ہوتے ہیں۔ معصومین علیہم السلام کی آراء اور اقوال کو بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ تفسیر بالرائے کا معنی ذکر کر دیا جائے۔

لفظ "رأی" کا معنی نظریہ، رائے اور اجتہاد ہے۔(4) تفسیر بالرائے سے مراد کلام الہی کے معانی کی تشریح اور تفسیر اپنی رائے اور نظریے کے مطابق کرنا نہ کہ دوسرے مفسرین کی آراء اور نظریات کو مد نظر رکھنا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو مشقت اور سختی میں نہ ڈالے کہ مفرد الفاظ کے معانی میں حقیقت کو مجاز سے، مشترک معنوی کو مشترک لفظی سے تشخیص نہ کرے، مجاز عقلی، لفظ میں مجاز اور اسناد میں مجاز کو ایک دوسرے سے تفکیک نہ دے۔ معانی اور مفاہیم کی وسعت اور تنگی میں فرق نہ کرے نیز اسباب النزول اور قرائن کو مد نظر نہ رکھے، ناسخ و منسوخ، عام و خاص، محکم اور متشابہ۔ مطلق اور مفید علم حاصل نہ کرے اور آیات کے بارے میں منقولہ رویات جو کہ قرآن کی تأویلات اور پیچیدگیوں کو واضح کرتی ہیں، کی طرف توجہ کیے بغیر، تفسیر کے اصول و قواعد کا خیال رکھے بغیر اپنی رائے اور نظریے کو قرآن پر تحمیل اور تھوپ دے بلکہ اپنی مذہب اور عقیدے کو ثابت کرنے کے لیے تفسیرے بالرائے کا سہارا لے۔

تفسیر بالرائے میں یہ چیز ممکن ہے دو طرح سے وقوع پذیر ہو۔

الف:۔ وہ معنی جو مفسر کی مراد ہو وہ فی حد ذاتہ صحیح ہو لیکن قرآن اس پر دلالت نہ کر رہا۔ پس یہاں پر استدلال میں غلطی ہوئی ہے نہ کہ مدلول میں۔

ب:۔ وہ معنی جو مفسر کی مراد ہو سرے سے ہی غلط اور باطل ہو اور قرآن کو اس باطل معنی پر عمل کرے جو کہ استدلال اور مدلول دونوں میں غلطی ہے۔(5)

کشف الظنون میں کاتب حلبی نے تفسیر بالرائے کی پانچ قسمیں کی ہیں۔

1. ان علوم کے بغیر تفسیر کرنا جن سے تفسیر کے آلات کے طور پر استفادہ کرنا ضروری ہے۔

2. متشابہ آیات کی تفسیر جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی آگاہ نہیں ہے۔
3. اس طرح تفسیر کرنا کہ اس کے ذریعے کسی خاص مذہب مسلک اور عقیدہ کو ثابت کیا جائے۔
4. ایسی تفسیر جو اللہ تعالیٰ کی مراد کو بغیر دلیل کے قطعی طور پر بیان کرے۔
5. ایسی تفسیر جو ہوا و ہوس اور استحسان کے مطابق ہو۔(6)

لیکن فیض کاشانی مرحوم نے اس مسئلے کو بڑے واضح انداز میں بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔اس کی نظر میں ممنوعہ اور نہی شدہ تفسیر کی دو صورتیں ہیں

1. کسی چیز کے متعلق مفسر کی خاص رائے ہو اور وہ اپنے مدعا کے اثبات کے لیے اپنے رجحان اور نفسانی خواہش کے مطابق قرآن کی تفسیر کرے اس طرح سے کہ اگر اس کا وہ نظریہ نہ ہوتا تو وہ قرآن یوں معنی اور مطلب نہ نکالتا۔اس صورت کی مزید دو قسمیں ہیں۔

ایک مرتبہ وہ جانتا ہے کہ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے قرآن سے یہ مطلب نکالنا، قرآنی آیت کا ہر گز مراد اور مقصود نہیں ہے۔

ایک مرتبہ وہ نہیں جانتا؛ لیکن جب آیت کے معنی کے بارے میں متعدد احتمالات ہوں اور وہ اس معنی کو ترجیح دے جو اس کی رائے کے موافق ہو اور وہ آیت کی اُسی طرح تفسیر کرے چنانچہ اگر اس کا وہ خاص نظریہ نہ ہوتا تو آیت کے اس معنی کو کبھی ترجیح نہ دیتا۔

کبھی انسان کا مقصد اور ہدف صحیح ہوتا ہے اور اس کے لیے وہ قرآن سے دلیل ڈھونڈتا ہے اور قرآن کی آیت سے تمسک کرتا ہے جبکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا مطلب کچھ اور ہے مثلاً ایک شخص چاہتا ہے کہ لوگ سحر خیز ہوں اور اس وقت استغفار کریں۔اس مقصد کے لیے وہ معصومین علیہم السلام کے اس کلام سے استفادہ کرتا ہے "تسحّروا فانَّ السحوَر برکة"

حالانکہ اُسے معلوم ہے کہ روایت میں "تسحّروا" سے مراد سحری کھانا ہے نہ کہ استغفار کے لیے سحر میں جاگنا ہے۔ باطنیہ مذہب کے پیروکار لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اسی طریقہ کار استعمال کرتے ہیں۔

2. ممنوعہ تفسیر کے دوسری صورت یہ ہے کہ تفسیر قرآن میں عربی الفاظ کے ظاہری معنی پر ہی اکتفا کیا جائے اور غرائب القرآن یا الفاظ مبہمہ، مبدلہ اور دیگر قرآن کی خصوصیات مثلاً اقتصار، حذف، اظہار، تقدیم وتأخیر، ناسخ ومنسوخ، عام وخاص واخص۔ غرائب اور محکم ومتشابہ جیسے مسائل کو حل کرنے اور واضح کرنے کے لیے اہلبیت علیہم السلام کی روایات کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ جو شخص قرآن کی تفسیر کرنا چاہتا ہے جو اُسے صرف عربی الفاظ کے ظاہری معنی کو سمجھنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہ بہت ساری غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہوئے تفسیر بالرائے میں مبتلا ہو جائے گا۔ (7)

معلوم ہے کہ یہ تمام اقسام تفسیرے بالرائے کی مصداق ہیں۔علامہ طباطبائی مرحوم تفسیر بالرائے کی حقیقت کو ایک اور طرح بیان کرتے ہیں۔(شاید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا بیان تمام اقوال کی جمع بندی ہے) وہ کہتے ہیں: ایسا عقیدہ اور نظریہ جو انسان انہی سعی و کوشش اور اجتہاد سے حاصل کرے یا پھر اپنی ہوا وہوس کی بنیاد پر بنائے تو اُسے رائے کہتے ہیں اور یہ جو روایات میں رائے کو ضمیر کی طرف مضاف کیا گیا ہے (مَنْ فسَّر القرآن برأیه) یہ امر کی دلیل ہے کہ مفسر کو اپنی ذات اور قرآن کے علاوہ کلام عربی کی شناخت کے ذرائع کے بل بوتے پر کلام اللہ کو سمجھنے سے نہی کی گئی ہے۔آیات الٰہی اگرچہ ایک دوسرے سے جدا اور منفصل الفاظ ہیں لیکن اس کے باوجود آپس میں مربوط اور متصل کلام ہے۔ بعض آیات بعض دوسری آیات کی تشریح کرتی ہیں جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا ہے۔بنابراین کلام الٰہی کو سمجھنے کا صحیح راستہ ایک موضوع سے مربوط تمام آیات کا مطالعہ اور ان میں تدبر ہے نہ کہ بعض آیات کا مطالعہ۔پس تفسیر بالرائے کے بارے میں روایات میں جس چیز سے منع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان ان قواعد اور اصول کی بنا پر آیات قرآن کو نہ سمجھے اور نہ ان کا مطالعہ کرے جو دوسروں کے کلام کو سمجھنے کے لیے بروئے کار لاتا ہے۔ (8)

ایک اور مقام پر وہ کہتے ہیں: تفسیر بالرائے کا لازمہ بغیر علم کے بات ہے چنانچہ حدیث نبویؐ "مَنْ قالَ فِی القرآن بغیرعلم ملیتبوّ مقعدہ من النّار "اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔(9)

البتہ یہ بات بھی طبیعی ہے جس طرح علامہ مرحوم کے الفاظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات کی اس کی دیگر آیات سے ہٹ کر تفسیر اور معنی نہیں کیا جاسکتا اور یہ اس کتاب کی ایک اور خصوصیت ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَنَّ الکتاب یُصدِّقُ بَعْضَہ بَعْضاً واَنَّہ لا اختلاف فیہ۔ فقال سبحانہ ولوکان من عندِ غیر اللہ لوجَدوافیہ اختلافاًکثیراً۔(10)

ترجمہ: "بے شک قرآن کا بعض دوسرے بعض کی تصدیق کرتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے چنانچہ ارشاد الہی ہے: اگر یہ قرآن غیر خدا کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بہت زیادہ اختلاف پائے۔"

حضرت علی علیہ السلام ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

ینطق بعضہ ببعض ویشھَدُ بعضہ علی بعض۔(11)

ترجمہ: "قرآن کا بعض، دوسرے بعض کے ذریعے بولتا ہے اور اس کا بعض، بعض دوسرے پر گواہی دیتا ہے۔"

درج ذیل روایایت قرآن کی آیات کے ایک دوسرے پر گواہ اور تصدیق کرنے کے مطلب کو اور زیادہ واضح انداز میں بیان کررہی ہے۔مروی ہے کہ امام جواد علیہ السلام نے سورہ مائدہ کی آیت 38 "والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھم "میں چور کے ہاتھ کاٹنے اور اس کی کیفیت کی تفسیر میں فرمایا:

"ہاتھ کو انگلیوں کی جڑوں سے قطع کیا جائے اور ہتھیلی کو باقی رکھا جائے"

جب آپؑ سے اس کی وجہ پوچھی کی گئی تو آپؑ نے رسول خداﷺ کے فرمان سے استدلال کیا جس میں آنحضرتﷺ نے فرمایا ہے:

"سجدہ سات اعضاء کا زمین پر لگنے سے متحقق ہوتا ہے یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ، دوزانو اور دو پاؤں کے انگوٹھے "پس اگر ہاتھ کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے تو اس کے لیے ہاتھ ہی باقی نہیں بچتا جس کے ذریعے وہ سجدہ کرے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَانَّ المساجدَ لِلّٰہِ "۔(جن۔17)

اور آیت مجیدہ میں مساجد سے مراد وہی سجدے کے سات اعضاء ہیں اور جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کے لیے اُسے قطع نہیں ہونا چاہیے فرمایا: وما کان لِلّٰہِ لم یُقْطَع۔"(12)

پس اگر کسی نے قرآن کی ایک آیت کو سمجھا لیکن دوسری آیات کی طرف توجہ نہ کی یا ان کے سمجھنے سے محروم تھا وہ ہر گز پہلی آیت کے مفہوم اور معنی کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا بلکہ اُس نے ایک کمزور مطلب آیت سے حاصل کیا ہے۔قرآن کی آیت کریمہ مجموعی طور پر اور ایک دوسرے سے مربوط کرکے سمجھا جائیں تو ان سے واضح مفہوم اور جامع مطلب حاصل ہوتا ہے۔ بعض آیات جو ابتدائی نگاہ میں مبہم دکھائی دیتی ہیں دوسری آیات ان کو بھی واضح اور روشن کر دیتی ہیں۔(13)

اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر آیات کے معانی اور تفسیر کو دیکھے بغیر بعض آیات کے ظاہری معانی پر اصرر کرنا انسان کو نہ صرف ان آیات کے معانی ومفاہیم نہیں سمجھاتا بلکہ یہ خود اس قسم کی تفسیر بالرائے ہے جس کی اہلبیت علیہم السلام کی متعدد روایات میں مذمت کی گئی ہے۔ مثلاً امام رضا علیہ السلام، رسول خدا ﷺ کے فرمان کو بیان کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ سے فرمایا:

ما آمن بی مَنْ فسّر برأیہ کلامی۔(14)

ترجمہ: "جس کسی نے میرے کلام کی اپنے نظریے اور رائے کے مطابق تفسیر کی وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا۔"

نیز حضرت علی علیہ السلام آئندہ کی پیشگوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"امام مہدی علیہ السلام خواہشات کو وحی کی ہدایت کے تابع قرار دیں گے جبکہ لوگ ہدایت کو اپنی ہواوہوس کے تابع قرار دیں گے اور جب لوگ اپنے مختلف نظریات اور خیالات کو تفسیر کے نام پر قرآن پر تحمیل کریں گے، وہ افکار اور نظریات کو قرآن کے تابع قرار دیں گے۔(15)

جیساکہ یہ بات عیاں اور ظاہر ہے کہ آپ کا لہجہ تفسیر بالرائے کی مذمت ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایک گروہ کے بارے میں پیشگوئی کرتے ہوئے بیان فرمایا:

۔۔۔۔۔۔کانّھم ائمّۃ الکتاب ولیس الکتابُ اما مجھم فلم یبق عندھم منہ الااسمہ ولایعرفون اِلاَّخطّہ وَزُبُرہ۔(16)

ترجمہ: " گویا وہ قرآن کے پیشوا میں اور قرآن ان کا امام اور پیشوا نہیں ہے پس قرآن صرف نام کی حد تک ان کے پاس رہے گا اور وہ قرآن کے خط روشنائی کے علاوہ کچھ نہیں جانتے ہوں گے "

ظاہر ہے کہ جو قرآن کی تفسیر بالرائے کرے گا در حقیقت اس نے اپنی فکر اور رائے کو قرآن پر ترجیح دی ہے اور وہ اپنے آپ کو کتاب الٰہی کا امام اور پیشوا گردانتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

وانّماھَلَکَ الناسُ فی المتشابِہِ لِاَنَّھم لم یَقِفُوا علی معناہ ولم یعرفوا حقیقتہ فوضعوا لہ تأویلات من عند اَنْفُسِھِم بآ رائِھِم واستغنوابذلک عن سالۃِ الاوصیاء ونبذوا قولَ رسولِ اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وراءَ ظُھورھم: (17)

اس روایت کے مطابق امام صادق علیہ السلام ،آیات متشابہ کے بارے میں تفسیر بالرائے کو لوگوں کی ہلاکت کا باعث قرار دیتے ہیں اس طرح سے کہ وہ اس قسم کی آیات کی حقیقت کو نہیں سمجھتے اور ان کو سمجھنے کے لیے اوصیاء الٰہی سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے ،اپنی رائے اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق آیات کا معنی اور تأویلات کرتے ہیں۔ایسے افراد کی امام صادق علیہ السلام سرزنش اور مذمت کرتے ہیں۔(18)

آیات قرآن کو آپس میں ملانا

متعدد روایات ایسی ہیں جو انسان کو "ضرب القرآن بعضہ بعض" یعنی آیات قرآن کو آپس میں خلط سلط کرنے سے منع کرتی ہیں۔ بطور مثال امام صادق علیہ السلام اپنے آباء واجداد سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ماضرب رجل القرآن بعضہ بعض الاّکفر

ترجمہ: " کوئی شخص قرآن کے بعض کو بعض دوسرے سے مخلوط نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ کافر ہو جاتا ہے۔"

یوں نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایات در حقیقت تفسیر بالرائے کے بعض مصادیق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ فیض کاشانی مرحوم اپنی قابل قدر تفسیر کے مقدمے میں مذکورہ بالا روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں: شاید "ضرب القرآن" سے مراد متشابہات قرآنی کی بعض کے ذریعے بعض کی تأویل اور تشریح ہو۔ اس طرح کہ اس تأویل اور تفسیر کو اہل قرآن سے سنے بغیر کیا گیا ہو اس میں نور الٰہی (جو اللہ تعالیٰ اُسے عطا کرتا ہے جو صلاحیت رکھتے ہوں) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت سے استفادہ نہ کیا گیا ہو اور وہ صرف ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کی بنیاد پر ہو۔ (19)

علامہ طباطبائی مرحوم نے بھی مذکورہ روایت جیسی رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث الدر المنثور سے نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں: جب آنحضرت ﷺ نے کچھ افراد کو قرآن کے متعلق بحث و مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا تو غضب ناک حالت میں فرمایا: گذشتہ امتیں بھی جو گمراہ ہوئی ہیں اس کی وجہ بھی یہی اختلافات تھے جو وہ اپنے پیغمبروں سے کرتے تھے۔ بعض نے اپنی آسمانی کتاب کو آپس میں خلط سلط کر دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ اس کا ایک حصہ بعض دوسرے حصے کی تکذیب کرے بلکہ اس لیے نازل ہوا ہے کہ اس کا بعض، بعض دوسرے کی تصدیق کرے۔ پس جو تم نے پہچان لیا اس پر عمل کرو اور جو تمہارے لیے متشابہ ہے (واضح نہیں ہے) اس پر ایمان رکھو:

اس روایت کے بعد وہ بیان کرتے ہیں کہ اہلبیت علیہم السلام "ضرب القرآن بعضه ببعض" والی روایات "آیات قرآنی ایک دوسرے کی نسبت تصدیق کرتی ہیں" والی روایات کے مدمقابل قرار پاتی ہیں اور "ضرب" کا مطلب قرآنی معانی کے مقامات کو آپس میں خلط کرنا اور ان کے اہداف و مقاصد کی ترتیب میں گڑبڑ کرنا ہے۔ مثال کے طور پر محکم کو متشابہ کی جگہ پر لیا جائے اور متشابہ کو محکم کا عنوان دیا جائے۔ (20)

اس بناء پر آیات کو آپس میں ملانے اور ان کے معانی کو مخلوط کرنے کی وجہ قرآن فہمی کے حوالے سے خطرات کی طرف توجہ نہ کرنا، فکری انحراف اور ذاتی رجحانات ہیں جو کہ خود ایک طرح کی تفسیر بالرائے ہے۔

فہم قرآن کے لیے خطرات

الف:۔روایات سے غفلت

قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے روایات کو نظر انداز کر دیناایک سنجیدہ مشکل ہے کیونکہ قرآن مجید اور رسول اکرم ﷺ کی تاکیدات کی بناء پر ہی تو معصومین علیہم السلام کا قول فعل اور تقریر حجت ہیں۔قرآن مجید کی آیات اِنّا انزلنا اِلیك الذکر لُتبین لِلنّاس مانُزّل اِلَیهم (نحل:44)[1] هُوَالَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ" (جمعہ۔2)[2]؛ اَطِیْعُواللهَ وَاَطِیْعُو الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ" (نسا:59)[3]اور بہت ساری دیگر آیات اہلبیت علیہم السلام اور ان کے نورانی اقوال سے تمسّک کرنے کو واجب قرار دیتی ہیں نیز اس حوالے سے بہت ساری روایات بھی تاکید کرتی ہیں خاص طور پر عظیم اور بابرکت حدیث ثقلین ہے جس میں رسول اکرم ﷺ فرماتے ہیں:

اِنّی تارِکٌ فیکم الثّقلینِ کتابَ اللّهِ وعِترَتی ما اِنَ تمَسّکتُم بِهما لَن تَضِلّوا اَبداً وَاِنّهما لَن یَفتَرقا حتی یَرِدا عَلیّ الحَوض۔(21)

علامہ طباطبائی کہتے ہیں اس حقیقت سے کہ قرآن روایات کے صحت و سقم کو جانچنے کا معیار ہے اور حدیث نبوی ﷺ "ماوافق کتاب اللهِ فخذوہ وما خالَفُه فاترکوہ" سے بعض افراد خصوصاً مادی بحثوں میں غرق اور جدید مغربی تہذب سے مرعوب افراد نے سوء استفادہ کیا ہے اور روایات میں آنے والے مطالب کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور تفریط کی راہ اپناتے ہوئے، محدثین،اخباریوں،طایفۂ حروریہ وغیرہ (جوہر روایت منقولہ کو جیسی بھی ہو،کی بناء پر قبول کرتے ہیں)کے مدمقابل آن کھڑے ہوئے ہیں۔جبکہ ہم جانتے ہیں کہ جس طرح ہر حدیث کو بطور مطلق بغیر کسی قید و شرط کے قبول کرنا ان اصول

1۔(اے رسولؐ)آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لیے نازل کیا ہے تاکہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتادیں جو ان کے لیے نازل کی گئی ہیں۔

2 ۔وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہی پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

3 ۔اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان امر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

اور معیارات کی تکذیب کرنا ہے جو حق کو باطل سے تمیز دینے کے معصومین علیہم السلام کے ذریعے بیان ہوئے ہیں۔ یہ بات خود قول باطل اور لغو بات کو رسول خدا ﷺ کی طرف نسبت دینے کا سبب بنتی ہے۔

اسی طرح سے اگر ان مقدس ہستیوں کے اقوال یکسر مسترد کر دیئے جائیں تو یہ امر ان روایت کی تکذیب بھی ہے اور مقدس کتاب قرآن کے مطالب کا ابطال بھی ہے جس میں سامنے اور پیچھے سے کہیں سے بھی باطل داخل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے:

"وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا" (حشر: 7)[4] دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (نساء: 64)[5] کیونکہ اگر رسول اللہ ﷺ کا قول یا ان کا نقل شدہ فرمان یا آپؐ کے نائبین کا فرمان ہمارے لیے یا خود اُن کے اپنے دور میں حجت نہ ہو تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا اور نظام اسلام بکھر جائے گا۔ جبکہ اخبار اور روایات پر انسان کا اعتماد ان امور میں سے ہے جسے قبول کرنا اجتماعی زندگی میں انسان کی مجبوری ہے کیونکہ یہ انسانی بدیہات اور فطریات میں سے ہے اور انسان اس سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ بات کہ دینی تعلیمات میں جعلی روایات بھی آئی ہیں یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی خاص دین کے ساتھ مختص ہو کیونکہ انسانی زندگی کے تمام اجتماعی پہلو اور جہات روزانہ کی عمومی اور خصوصی خبروں کے گرد گھومتے ہیں جن میں ہر قسم کا جھوٹ، فریب اور اختلاط کثرت سے پایا جاتا ہے اور ان میں سیاسی شعبدہ بازوں کے ہاتھ زیادہ کھلے ہوتے ہیں۔

البتہ ہم اپنے فطری تقاضوں کے عین مطابق خبروں کے سننے پر فقط اکتفا نہ کریں بلکہ ان میں سے ایک ایک کو متعلقہ معیارات اور کسوٹی پر پرکھیں پھر جو اس میزان اور معیار پر پوری اترتی ہوں انہیں قبول کریں بصورت دیگر انہیں رد کر دیں۔ اگر ہم واقعاً اس طریقے سے روایات کی صحت و سقم کو پرکھ سکیں تو پھر اس روایت کے بارے میں توقف کریں گے یعنی نہ ہی قبول کریں گے اور نہ ہی رد کریں گے اس کی وجہ

4۔ اور رسول جو تمہیں دے دیں وہ لے لو اور جس سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

5۔ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا اس لیے بھیجا ہے کہ باذن خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

بھی راہ احتیاط اختیار کرنا ہے کیونکہ جہاں ضرر کا احتمال ہو وہاں ہر انسان احتیاط کے راستے پر چلتا ہے۔(22)

بہر حال اہلبیت علیہم السلام کی روایات کو نظر انداز کرنا قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے بہت بڑی مشکل اور رکاوٹ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بہت سارے موارد میں روایات سے تمسّک کیے بغیر آیات کا حقیقی مقصود اور مراد ہمارے لیے واضح نہیں ہو پائے گا مثلاً امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں: ایک شخص پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: میں رات کو مجنب ہو گیا تھا میرے پاس غسل کے لیے پانی نہیں تھا۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا: پس تو نے کیا کیا؟ اُس نے بتایا: میں مٹی پر لیٹ کر الٹ پلٹ ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: یہ تو گدھے کا کام ہے تحقیق اللہ تعالیٰ فرمایا ہے: "فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّبًا" (نسا: 43)[6] پھر آپ نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا اور انہیں ایک دوسرے پر کھینچا پھر اپنے ہاتھوں کو اپنے پیشانی پر کھینچا اور پھر دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ذریعے مسح کیا۔(23)

سچی بات ہے اگر ہم امام باقر علیہ السلام کی اس حدیث کو ملاحظہ نہ کرتے تو مذکورہ آیت کا کس طرح معنی کرتے؟ شیخ طوسی مرحوم اس بارے میں کہتے ہیں: قرآن کے معانی کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ ہے جن کا علم ذات باری تعالیٰ سے مخصوص ہے دوسروں کو ان میں کچھ کہنے کی مجال نہیں ہے کیونکہ وہ ان چیزوں کا علم ہی نہیں رکھتے: جیسے "يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ" (اعراف: 187)[7] اور "اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" (لقمان: 34)[8]

معانی قرآن کی دوسری قسم یہ ہے کہ جو بھی عربی زبان کو جانتا ہو وہ آسانی سے ان معانی کو سمجھ سکتا ہے جیسے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (توحید: 1)[9] اور وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (انعام: 151)[10]

6۔ تو پاک مٹی پر تیمّم کرو۔

7۔ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ قیامت واقع ہونے کا وقت کب ہے؟ کہدیجیے: اس کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے، قیامت کے وقت کو اللہ کے سوا کوئی ظاہر نہیں کر سکتا۔

8۔ قیامت کا علم یقیناً اللہ ہی کے پاس ہے۔

9۔ کہدیجیے: وہ اللہ ایک ہے۔

تیسری قسم کے مطالب میں اجمال پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح سے نہیں ہیں کہ مراد و مقصود کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔ جیسے "اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ (بقرہ:43)[11] وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا" (آل عمران:97)[12] اور "وَ اٰتُوۡا حَقَّہٗ یَوۡمَ حَصَادِہٖ" (انعام:141)[13] ان امور میں ،نمازوں کی تعداد اور ان کی رکعات کی تفصیل، حج اور اس کی شرائط کی تفصیل اور زکوۃ میں نصاب کی مقدار کے بارے میں معلومات کے لیے رسول اکرم ﷺ کے بیانات اور وحی الٰہی کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔ چوتھی قسم ایسے موارد پر مشتمل ہے جن میں قرآن کے الفاظ دو یا اس سے زیادہ معانی کے درمیان مشترک ہیں اور ہم حقیقی مراد کو تشخیص بھی نہیں دے سکتے۔ یہاں پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے ان میں سے فلاں احتمال اللہ تعالیٰ کا مقصود اور مطلوب ہے بلکہ آیت کے معانی کی وضاحت کے لیے ہمیں نبی اکرم ﷺ یا آئمہ معصومین علیہم السلام کے اقوال سے متمسک ہونا پڑے گا۔(24)

تفسیری روایات

علم اصول میں امر مسلم یہ ہے کہ خبر متواتر یا قرائن قطعیہ ملبوس اخبار اور قولِ معصوم علیہ السلام سے کاشف اجماع محقل حجت ہیں۔ لیکن یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اخبار آماد (خبر واحد) تمام امور (احکام اور معارف) میں حجت ہیں یا فقط احکام کے باب میں حجت ہیں؟

علامہ طباطبائی مرحوم کی طرح کے بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ غیر قطعی خبر جسے اصطلاح میں خبر واحد کہتے ہیں اور جس کی حجیت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف ہے؛ سے استفادہ مفسر کے نظریے پر منحصر ہے۔ اہل سنت کے ہاں عام طور پر خبر واحد پر مطلقاً عمل کیا جاتا ہے جسے ان کی اصطلاح میں "صحیح" کہا جاتا ہے۔ شیعہ مکتبہ فکر میں اب تک علم اصول میں جو چیز مسلم ہے وہ یہ ہے کہ خبر واحد موثوق الصدور احکام شرعیہ میں حجت ہے لیکن اس کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔(25)

---

10 ۔اور جس جان کے قتل کو اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرو ہاں مگر حق کے ساتھ۔

11 ۔نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔

12 ۔اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے۔

13 ۔ان کی فصل کاٹنے کے دن اس (اللہ) کا حق (غریبوں کو) ادا کرو۔

البتہ جو چیز ہمیں سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ شارع مقدس نے ایسی خبر واحد کو ہمارے لیے بمنزلہ علم قرار دیا ہے جس میں حجیت کی شرائط پائی جاتی ہوں۔ چنانچہ یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ہم کہیں کہ اس طرح کی شرائط کی حامل اخبار احکام شرعیہ سے ہی مربوط اور متعلق ہوں تاکہ وہ حجت بن سکیں اور اگر تفسیر اور دیگر دینی تعلیمات سے متعلق ہوں تو حجت نہیں ہیں لہٰذا اس پر اپنے مقام پر بحث اور تحقیق ہونی چاہیے۔ (26)

پس آیات کی تفسیر کے موقع پر مربوط روایات کو مد نظر رکھنے کی ضرورت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے بصورت دیگر روایات کو نظر انداز کرنے سے تفسیر بالرائے کا نتیجہ نکلے گا۔

قرآن کی خصوصیات سے غفلت (پس پشت ڈالنا)

اہلبیت علیہم السلام کے نظریے کے مطابق قرآن مجید چند خصوصیات کا حامل ہے جن کی طرف توجہ کیے بغیر قرآن کی تفسیر اور فہم القرآن نیز آیات الٰہی کے مقصود اور مراد کو سمجھنا ناممکن ہے وہ خصوصیات، قرآن کا ظاہر و باطن ہونا، تأویل، ناسخ و منسوخ محکم و متشابہ وغیرہ سے عبارت ہیں۔ ان خصوصیات کو مد نظر نہ رکھ کر قرآن کی تفسیر درحقیقت تفسیر بالرائے ہی ہوگی۔

ا۔ قرآن کے ظاہر و باطن کو مد نظر نہ رکھنا

معصومین علیہم السلام کی روایات سے یوں مطلب نکلتا ہے کہ جس طرح قرآن مجید کے ظاہری معانی ہیں اسی طرح اس کے باطنی معانی بھی ہیں جنہیں عربی زبان کے الفاظ اور تمام تر قواعد واصول پر مہارت رکھنے کے باوجود دریافت نہیں کیا جاسکتا۔

جابر بن یزید بیان کرتے ہیں: میں نے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کے متعلق امام باقر علیہ السلام سے سوال کیا، انہوں نے جواب دیا۔ میں نے دوبارہ سوال کیا امام علیہ السلام نے ایک اور جواب دیا۔ میں نے عرض کیا۔ یا بنؑ رسولؐ اللہ! پہلے میں نے یہی سوال کیا تو آپؑ نے دوسری طرح جواب دیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا:

یاجابر:اِنَّ للقرآنِ بَطناً ولِلبَنِ بطنٌ وظھرٌ وللظُھرِ۔ یاجابر لیس شیٔ اَبْعَدُ مِنْ عُقولِ الرِّجال مِن تفسیرالقرآن۔اِنَّ الآیۃ یکون اوّلھا فی شیئ و آخرھافی شیئ وھو کلامٌ متصلٌ متصرفٌ علی وجوہٍ" (27)

اس روایت کے پیش نظر بعض افراد کا یہ خیال ہے کہ "قرآن کے ظاہر و باطن "کا مطلب بعض آیات کے مختلف پہلو اور جوانب کا ہونا ہے۔مثلاً ممکن ہے ایک آیت کے متعدد،اخلاقی،سیاسی اور معاشرتی پہلو ہوں۔(28) لیکن دیگر روایات کی روشنی میں اس طرح کا قول مخدوش معلوم ہوتا ہے۔

عبداللہ بن سنان،ذریح محاربی سے نقل کرتے ہیں کہ اس نے امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: میں آیت شریفہ "ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ (حج: 29)[14] کے معانی کو جاننا چاہتا ہوں۔ امام علیہ السلام نے اُسے فرمایا: "لیقضوتَفَثَهُم" سے مراد،امام سے ملاقات ہے(یعنی لوگ حج انجام دینے کے بعد امام کی خدمت میں حاضری دیں)اور "وَلْيُوفوانذورھم"کا معنی مناسک حج کو بجالانا ہے۔

عبداللہ بن سنان کہتے ہیں: میں بھی امام کی خدمت میں مشرف ہوا اور وہی باتیں پوچھیں۔آپؑ نے فرمایا: "اَخذُ الشارب وقصُّ الاظفار وما اشبہ ذلك" یعنی مونچھیں اور ناخن کاٹنا اور اس طرح کی دیگر چیزیں۔ میں نے عرض کیا ذریح محارلی نے آپؑ سے وہ معنی نقل کیا ہے۔(یعنی امام سے ملاقات اور مناسک کی انجام دہی)آپؑ نے فرمایا:

صدق ذریح وصَدَقْتَ اِنَّ للقرآن ظاھراً وباطناً ومن یحتمل مایحتمل ذریح؟" (29)

ترجمہ: "ذریح نے بھی سچ کہا ہے اور تو وہ سچا ہے۔بے شک قرآن کا ظاہر بھی اور باطن بھی اور کون تحمل کرتا ہے جو ذریح نے کیا؟"

اس روایت سے اچھی طرح ثابت ہوتا ہے کہ جو کچھ امام علیہ السلام نے عبداللہ بن سنان کے جواب میں فرمایا وہ ظاہر قرآن سے مربوط تھا اور جو مطلب ذریح کے سوال کے جواب پر بیان فرمایا،اس کا تعلق باطن

14 ۔پھر وہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی نذریں پوری کریں۔

قرآن سے تھا مثلاً آپ نے "لیقضوا تفثھم "کا مطلب "امام سے ملاقات" ذکر کیا اور آیات قرآن سے ہر کوئی اس طرح کا معانی اخذ نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے فہم کا اہل بیت علیہم السلام کے حیات بخش مکتب سے الہام لیے بغیر دعویٰ کرنا، تفسیر بالرائے ہے۔

ایک اور مقام پر "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" (حمد: 6)[15] کی تفسیر میں حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

هو امیر المومنین علیه السلام و معرفتُه و الدلیلُ علی انَّه امیر المومنین قولُه عزّو جلَّ: وَاَنَّه فی اُمّ الکتاب لدینا لعلیّ حکیم وهو امیر المومنین (علیه السلام) فی اُمّ الکتاب فی قوله تعالیٰ "اهدنا الصراط المستقیم" (30)

صراط مستقیم امیر المومنینؑ اور ان کی معرفت ہے اور اس کی دلیل قرآن مجید کی یہ آیت وَاَنَّه فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم" اور ام الکتاب میں امیر المومنین اهدنا الصراط المستقیم ہیں۔

پس اگر ہم آیت کے ظاہر کو دیکھیں تو جس طرح مفسرین نے کہا ہے اللہ کی ضمیر قرآن کی طرف لوٹ رہی ہے اور ام الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے۔ لیکن روایت میں امامؑ نے اللہ کی ضمیر کو حضرت علی علیہ السلام کی طرف لوٹایا ہے اور ام الکتاب کی تفسیر سورہ حمد سے کی ہے اور فرمایا "اهدنا الصراط المستقیم" اس میں قرار پائی ہے اس بنیاد پر انہوں نے اس آیت کو اس بات پر دلیل قرار دیا ہے کہ صراط مستقیم امیر المومنین علیہ السلام ہیں۔ (31)

۲۔ قرآن میں جری وانطباق سے غفلت

فہم قرآن میں ایک اور مشکل اور رکاوٹ آیات الہی کے جری و انطباق سے عدم توجہ ہے۔ جری و انطباق کا مطلب یہ ہے کہ آیات الہی صرف کسی خاص دور اور زمانے کے خاص لوگوں کے لیے نازل نہیں ہوئیں

15 ۔ ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما۔

بلکہ یہ الٰہی کتاب تا قیامت انسانیت کی سعادت ابدی کی طرف راہنمائی کرتی رہے گی۔قرآن خود فرماتا ہے۔

تبارك الذی نَزَّل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نزیراً (فرقان: 1)

ترجمہ: "پس قرآن کی آیات، اس کے احکام اور تعلیمات ہر زمانے میں قابل تطبیق ہیں۔"

علامہ طباطبائی لکھتے ہیں کہ چونکہ قرآن ایک ابدی اور تمام انسانوں کے لیے کتاب ہے۔ اس دلیل کی بناء پر غائیب میں حاضر کی طرح جاری وساری ہے اور ماضی اور مستقل میں حال کی طرح منطبق ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ آیات جو زمانہ نزول میں خاص صورتحال اور شرائط میں مومنین پر کچھ فرائض اور ذمہ داریاں عائد کرتی ہیں۔ نزول قرآن کے دور کے بعد والے مومنین پر انہی شرائط کے ساتھ بغیر کمی وبیشی کے وہی فرائض لاگو ہوتے ہیں۔ وہ آیات جو بعض صفات کے حامل افراد کی مدح وتعریف یا مذمت وسرزنش کرتی ہیں یا بشارت دیتی ہیں یا ڈرتی ہیں وہ ان صفات سے متفق ہر دور اور ہر زمانے اور ہر علاقے کے لوگوں کو شامل ہیں۔

بناء برایں کسی آیت کا نشان نزول یا سبب نزول اس آیت کا ہر گز مخصص نہیں ہوگا یعنی وہ آیت جو کسی خاص شخص یا اشخاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ اسی میں منحصر نہیں رہے گی بلکہ ہر اُس مورد (موقع) میں سرایت کرے گی جو صفات اور خصوصیات میں آیت کے سبب نزول میں شریک ہوگا اور یہ وہی امر ہے جیسے روایات میں "جری" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (32)

اہل بیت علیہم السلام نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ امام محمد باقر علیہ السلام ایک روایت میں فرماتے ہیں:

"۔۔۔ولوانَّ الآیة اذا نُزِّلَتْ فِی قوم ثُمَّ مات اولئك القوم ماتَتْ الآیةُ بَقیَ من القرآن شیئ ولکنَّ القُرآمن یَجْرِیْ اَوّلُه علی آخره مادامت السموات والارض ولِکُلِّ قوم اية یتلونها هم منها مِن خیراوشرّ" (33)

یعنی "اگر ایک آیت کسی قوم یا گروہ کے بارے میں نازل ہو پھر وہ قوم یا گروہ مر جائے تو آیت بھی مر جائے گی اور اس طرح قرآن میں سے کچھ باقی نہیں بچے گا۔ لیکن قرآن اوّل سے لے کر

آخر تک جاری وساری ہے جب تک زمین وآسمان قائم ہیں۔ ہر قوم کے اچھے اور بُروں کے لیے آیت ہے جس کی وہ تلاوت کرتے ہیں۔"

یہ حدیث مسئلہ جری کو اچھے انداز سے واضح کر رہی ہے۔ روایت کے مطابق اگر آیت ایک قوم کے بارے میں نازل ہوئی جب وہ قوم مر گئی تو ان سے مربوط آیت بھی فوت ہو جائے گی اس طرح سے تو قرآن باقی نہیں رہے گا حالانکہ قرآن زندہ جاوید ہے، جب تک زمین وآسمان قائم ہیں، قرآن باقی رہے گا۔ ہر قوم کے لیے آیت ہو گی جس کی وہ تلاوت کرتے ہیں یا وہ خیر وخوبی کا استفادہ کرے گی یا پھر اُس سے شر کا حصہ پائے گی۔ ایک اور روایت میں امام محمد باقر علیہ السلام قرآن کے متعلق فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔یجری کما یجری الشمسُ والمر" (34)

پس اس بات پر اصرار کرنا کہ آیات اپنے زمانہ نزول سے مربوط ہیں اور سبب نزول مخصص ہے، یہ نہ صرف فہم القرآن میں رکاوٹ اور مشکل ہے بلکہ ایک طرح کی تفسیر بالرائے ہے۔

البتہ اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ انسان فہم القرآن میں اس اہم بات سے غافل نہ رہے اور آیات کے مصادیق جو روایات میں بیان ہوئے ہیں انہیں بعنوان تأویل یا باطن قرآن حساب کرے۔ بطور مثال اس آیت "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِينَ" (توبہ: 119)[16] کے حوالے سے روایات نقل ہوئی ہیں کہ صادقین سے مراد حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت علیہم السلام ہیں (35) یا پھر سورہ زمر کی آیت نمبر 9 قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ۔ (زمر: 9)[17] کے بارے میں جابر جعفی نے امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کیا ہے انہوں نے فرمایا: "والّذِین یعلمون" ہم اہل بیتؑ ہیں اور "الذین لایعلمون" سے مراد ہمارے دشمن "اولوالالباب" سے مراد ہمارے شیعہ ہیں (36)

پس اس طرح کی احادیث مصداق کو بیان کرتی ہیں یہ تأویل اور باطن قرآن نہیں ہے۔

16 ۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

17 ۔ کہہ دیجئے: کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے یکساں ہو سکتے ہیں؟ بے شک نصیحت تو صرف عقل والے ہی قبول کرتے ہیں۔

۳۔قرآن کا تأویل رکھنے سے غفلت (لاپرائی)

قرآن کی ایک اور خصوصیت اس کا تأویل رکھنا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی طرف خود قرآن نے اشارہ کیا ہے۔(37)اور اہل بیت علیہم السلام کی روایات نے بھی متوجہ کیا ہے۔(38)رہی یہ بات کہ تأویل قرآن کی حقیقت کیا ہے؟اس سے مراد وہی تفسیر ہے یا ہر آیات کے ظاہری معانی کے برخلاف معنی یا دیگر معانی مراد ہیں، اس بارے میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے جس پر بحث و گفتگو اس مقالے کے بس کی بات نہیں ہے۔

علامہ طباطبائی بیان کرتے ہیں: ہر چیز کی تأویل وہ حقیقت ہے جو اس چیز کا سرچشمہ ہوتی ہے اور وہ چیز ایک طرح سے اُسے تحقیق بخشتی ہے،اس کی حامل اور اس کی نشانی ہوتی ہے۔ یہی مطلب قرآن پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ مقدس کتاب حقائق اور معنویات کے ایک مجموعے سے سرچشمہ لیتی ہے جو مادہ اور جسمانیت کی قیود سے آزاد، حواس اور محسوسات کی دنیا سے ماوراء اور الفاظ وعبارات جو کہ مادی زندگی کا ماحصل سے کہیں وسیع تر اور بالاتر ہے۔

درحقیقت یہ حقائق اور معنوی وروحانی باتیں الفاظ کے قالب میں نہیں سما سکتیں۔عالم غیب اور عالم بالانے صرف یہ کام کیا ہے کہ ان الفاظ کے ذریعے عالم بشر کو خبردار اور آگاہ کیا ہے کہ وہ اپنے ظاہری اعتقادات حقّہ اوراعمال صالحہ کے ساتھ اپنے آپ ایسی سعادت کے ادراک کے قابل بنائیں جس کے مشاہدے اور ادارک کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ قیامت اور اللہ سے ملاقات کے دن یہ حقائق مکمل طور پر واضح اور روشن ہوں گے۔(39)

وہ روایات جو قرآن کے لیے تأویل پر دلالت کرتی ہیں ان میں ایک روایت ابو عبیدہ نقل کرتے ہیں: وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے آیت "الٓمّٓOغُلِبَتِ الرُّوۡمُOفِی اَدۡنَی الۡاَرۡضِO " (روم:3,2,1)[18] کے متعلق امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا تو انہوں نے جواب میں فرمایا:

انّ لھذا تأویلا لا یعلمّہ الا اللہ والراسیخون فی العلم مِنَ الائمّۃ (علیھم السلام)(40)

18 ۔الف،لام، میم۔رومی مغلوب ہوگئے۔قریبی ملک میں۔

پھر آپؑ ہی سورہ آل عمران کی آیت 7 کے حوالے سے روایت میں فرماتے ہیں :

نحن الراسخون فی العلم ونحنُ نعلمُ تأویلَهٗ " (41)

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تأویل رکھتا ہے۔اسی طرح بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تأویل قرآن کو اہلبیت علیہم السلام سے حاصل کرنا چاہیئے۔ مثلاً ایک حدیث میں امام حسن عسکری علیہ السلام قرآن سے متمسک اس شخص کو گردانتے ہیں جو تأویل قرآن کو اہلبیت علیہم السلام سے اخذ کرے نہ کہ مجادلہ ومناظرہ کرنے والوں اور فاسقوں سے۔قال علیه السلام :"اَتدرونَ مِنَ المتمسك به الّذین له بتمسّکه هذا الشرف العظیم؟هوالّذی اَخذالقرآن و تأویله عنّا اهل البیت عن وسائطنا السفرّاء عنّا الی شیعتنا لاعن آراء المعادلین وقیاس الفاسقین "۔(42)

پس اس روایت کے مطابق جو قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ تأویل قرآن کو اہلبیت علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی طرف ان کے سفیروں سے دریافت کرے۔ کیونکہ قرآن کریم،اللہ کی رسی ہے جو عرش الٰہی سے لٹکی ہوئی ہے اور نزول کے مرحلہ میں "لسان عربی مبین"تک پہنچی ہے تاکہ سب لوگ قرن کی تلاوت کرنے یا سننے کے بعد ،غور وفکر اور تدبر کے ساتھ اس سے بہرہ مند ہوں اور قرآن کے ساتھ معنوی عروج حاصل کریں۔ارشاد الٰہی ہے؛

حٰمٓO وَالْكِتَابِ الْمُبِيْنِO إِنَّا جَعَلْنٰاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (زخرف: 1-3)[19]

قرآن کریم کے درجات ہیں اس کے بعض بلند درجے اور مراتب اہل فکر ونظر کی دسترس میں نہیں ہیں کیونکہ یہ درجہ مفہوم وماہیت اور تصور وتصدیق سے ماوراء ہے یہ درجات عام بشر کی فکر سے قابل دریافت نہیں، مگر یہ کہ خود انسان پرواز کرے اور اس بلند وبالا مقام تک جا پہنچے اور قرآن کی حقیقت کو اس بلند مقام سے پالے۔(43)

۴۔قرآن میں ناسخ ومنسوخ سے بے توجہی

19 ۔حا، میم۔اس روشن کتاب کی قسم۔ہم نے اس (قرآن) کو عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔

"ایثار اور زہد" کے بارے میں صوفیوں سے بحث واستدلال کے موقع پر امام صادق علیہ السلام نے انہیں فرمایا:

"أَلَکم علمٌ بِنَاسخِ القرآن و منسوخِه و مُحکَمِہ و متشابِهِہ الّذِی فی مثله ضلَّ وهلك مِنْ هذه الامّة؟۔۔۔۔فبئسَ ما ذهبتم اليه وحمّلتُم النّاسَ عليه من الجَهْلِ بكتابِ اللهِ وسنّة بنبيّه (صلی الله عليه و آله) واحاديثه الّتی يُصدّقُها الكتابُ... مُحكمه من متشابه"۔ (44)

جیسا کہ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ اس روایت میں امام صادق علیہ السلام نے قرآن کی بعض خصوصیات خاص طور پر ناسخ و منسوخ کا تین مرتبہ ذکر کیا ہے اور وہ سرزنش اور ملامت کے انداز میں کہ کیوں ناسخ و منسوخ جیسی خصوصیات کے علم کے بغیر قرآن کی تفسیر کرتے ہو؟!

مذکورہ روایت اور اس جیسی متعدد روایتوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ناسخ و منسوخ آیات سے غفلت اور عدم توجہ آیات الٰہی کے فہم اور سمجھنے میں اہم مانع اور رکاوٹ ہے۔

"نسخ" یعنی ایسا امر جو شریعت مقدس میں ثابت ہو اور اس کی مدت ختم ہونے پر اُسے اٹھالیا جائے۔ واضح ہے کہ اس طرح کے محدود اور موقت احکام حکمت الٰہی کے مطابق وضع ہوتے ہیں اور لوگوں کا بھی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں۔ (45) مثلاً جب لوگ آنحضرت ﷺ کے ارد گرد آپؐ سے بہت زیادہ سرگوشیاں کرتے تھے (46) تو آپؐ اُن کے دیر تک بیٹھنے اور سرگوشیاں کرنے سے ناراحت ہوئے تو اس موقعہ پر حق تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ (مجادله: 12)[20]

البتہ اس دوران فقط حضرت علی علیہ السلام تھے جو صدقہ دے کر حضور اکرم ﷺ سے نجوا کرتے تھے پھر کچھ عرصے بعد دوسری آیت نازل ہوئی اور اس نے اس حکم کو منسوخ کر دیا: ارشاد رب العزت ہوا:

20 ۔اے ایمان والو! جب تم رسول سے سرگوشی کرنا چاہو تو اپنی سرگوشی سے پہلے کچھ صدقہ دے دیا کرو، یہ بات تمہارے لیے بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے، ہاں اگر صدقہ دینے کے لیے کچھ نہ پاؤ تو اللہ یقیناً بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

ءَ اَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (مجادلہ: 13)[21]

طبری نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے حوالے سے اس حکم کے منسوخ ہونے پر متعدد احادیث نقل کی ہیں، روایت بیان کرتی ہیں کہ صرف علی علیہ السلام نے اس آیت کریمہ پر عمل کیا۔

عن مجاهد قال علی علیه السلام: آيةٌ من كتاب الله لم يُعْمل بها احدٌ قبلی ولا يُعمل بها احدٌ بعدی وكان عندی دينارٌ فصرفته بِعشرةِ دراهم فكنت اذا جئت اِلیَ النبی (صلی الله علیه وآله) تصدَّقتُ بدرهم فَتُسِخَتْ فلم يَعمل بها احدٌ قبلی: يا ايها الّذين آمنو اذا ناجيتم الرسولَ فقدّموبين يدی نجواكم صدقً۔" (47)

البتہ اصل میں نجوا (سرگوشی) بذات خود واجب نہ تھا، یہ لوگ تھے جو مال ذخیرہ کرنے، صدقہ دینے اور پیغمبر اکرم ﷺ سے نجوا کرنے سے زیادہ اہمیت کے قائل تھے لیکن امیر المومنین علی علیہ السلام کے نزدیک رسول خدا ﷺ سے راز و نیاز کی اتنی اہمیت تھی کہ وہ صدقہ دے کر بھی آنحضرت ﷺ سے نجوا کے لیے آمادہ تھے۔اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کے فضائل کو آشکار کیا۔(48)

بہرحال یہ کس طرح ممکن ہے کہ انسان ناسخ و منسوخ کا علم نہ رکھتا ہو اور وہ قرآن کی تفسیر کرنے لگ جائے؟ رہی یہ بات کہ قرآن کی کتنی آیات دیگر آیات کے ذریعے منسوخ ہوئی ہیں ان کی تعداد کے بارے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے(49)البتہ اس بات میں کوئی شک وترویدنہیں ہے کہ اس قسم کی آیات ایک محدود وقت کے لیے تھیں،اس میں حکمت الٰہی کارفرما تھی یا امتحان درکار تھا یا دیگر احکام فرائض کو دریافت کرنے کے آمادگی مقصود تھی یا پھر کوئی دیگر مصلحتیں تھیں جو ہمیں معلوم نہیں۔ نیز اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اہلبیت علیہم السلام کی روایات کی روشنی میں فہم القرآن کے طالب اور ایک مفسر کو ان آیات کی طرف ضرور توجہ دینے کی ضرورت ہے اور ان سے لاپرواہی آیات قرآنی کے فہم کے عنوان سے بڑی آفت ہے اور ایک اور قسم کی تفسیر بالرائے ہے۔

21 ۔کیا تم اپنی سرگوشیوں سے پہلے صدقہ دینے سے ڈر گئے ہو؟اب جب تم نے ایسا نہیں کیا اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا۔

۵۔قرآن میں محکم و متشابہ کی موجودگی سے بے اعتنائی

جس طرح قرآن مجید خود اس بات کو کھل کر بیان کرتا ہے کہ اس میں محکم آیات ہیں اور متشابہ آیات بھی "هُوَ الَّذِی أَنزَلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ" (آل عمران: 7)[22] اسی طرح اہلبیت علیہم السلام کی روایات بھی اس بارے میں خبردار کرتی ہیں کہ مبادا محکمات و متشابہات کے علم کے بغیر قرآن کی تفسیر کی جائے، کیونکہ قرآن کی اس خصوصیت یعنی محکم و متشابہ کے وجود سے غافل ہونا فہم قرآن کے لیے بڑی رکاوٹ ہے۔البتہ توجہ رہے کہ "متشابہ" کا معنی آیات قرآنی کا بے معنی ہونا نہیں۔

اس بارے میں علامہ طباطبائی اظہار فرماتے ہیں : محکم اور متشابہ کے معانی کے متعلق علماء اسلام کے درمیان عجیب اختلاف موجود ہے۔اِن اقوال میں چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً بیس (20) قول اِس مسئلے میں پائے جاتے ہیں۔(50)

ایک اور مقام پر وہ کہتے ہیں :آئمہ اہلبیت علیہم السلام کے مختلف بیانات سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں متشابہ ایک ایسی آیت کے معنی ہیں جس کا حقیقی مدلول کس طرح سے بھی معلوم نہ ہو، موجود نہیں ہے بلکہ متشابہ کا معنی ایک ایسی آیت ہے جس کا حقیقی مدلول بذات خود اور مستقل طور پر اگرچہ معلوم نہ ہو لیکن دیگر آیات کی مدد سے اس کے حقیقی مدلول تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے اور یہ وہی متشابہ کو محکم کی طرف پلٹانے والی بات ہے۔(51)

نیز امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

> منْ ردّ متشابه القرآن الی محکمه هُدِیَ الی صراط مستقیم" ثم قال:"اِنَّ فی اخبارنا متشابها لَمتشابه القرآن فَرُدُّوا متشابهها الی محکمها ولا تتّبِعوا متشابهها فتخّلوا۔(52)

---

22 ۔وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں وہی اصل کتاب ہیں اور کچھ متشابہ ہیں، جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

یہ روایت بھی متشابہات قرآنی کو محکمات کی طرف پلٹانے پر خوب دلالت کرہی ہے نیز قرآن میں اس خصوصیت سے عدم آگاہی اور متشابہات کو محکمات کی طرف پلٹائے بغیر آیات الہی کو سمجھنا ممکن نہیں ہوگا، بھی روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

مذکورہ روایت سے ایک اور نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ قرآن کی طرح اہلبیت علیہم السلام کی روایات میں محکم ومتشابہ موجود ہیں لہٰذا ان کے متشابہات کو بھی محکمات کی طرف پلٹانے کی ضرورت ہے۔ "متشابہ" سے مراد کیا ہے؟ روایات اس سوال کا جواب خوب دیتی ہیں مثلاً جب یہی سوال حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

واما المتشابه من القرآن فهو الّذی انحرف منه متفق اللفظ مختلفُ المعنی مثل قوله عزّوجلّ "يُضلُّ الله من يشاءُ ويهدی من يشاءُ" فنسب الضلالةَ الی نفسه فی هذا الموضوع وهذا ضلالُهم عن طريق الجنّةِ بِفِعْلِهم ونسبه الی الكفار فی موضع آخر ونسبه الی الاصنام فی آية اخری فمعنی الضلالة علی وجوه فمنه ماهو معبودٌ وعنه ماهومذموم ومنه ها ليس بمحمود ولامذموم ۔(53)

جیسا کہ نظر آتا ہے کہ حضرت علیؑ نے "متشابہ" ایسے لفظ کو کہا ہے جس کے مختلف معانی ہوں جیسے "يُضِلُّ اللّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ" (ابراہیم: 4)[23] یہاں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اضلال یعنی گمراہ کرنے کو اپنی طرف نسبت دی ہے جبکہ اس سے مراد ان کے غلط اعمال کی وجہ سے بہشت سے گمراہ کرنا ہے نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شروع سے ہی گمراہ کیا ہے۔ اضلال کئی جگہوں پر ذکر ہوا ہے اور جیسا کہ روایت نے بھی بیان کیا ہے اس کی متعدد اقسام ہیں، ان میں سے بعض قابل تعریف ہیں اور بعض دیگر قابل مذمت اور تیسری قسم نہ قابل تعریف اور نہ قابل مذمت۔

23 ۔اس کے بعد اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

اس کے بعد روایت نے تفصیل سے انہیں بیان کیا ہے کہ قرآن کے محکمات اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ نہیں کرتا "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُم مَّا يَتَّقُونَ" (توبہ: 115)[24] کی روشنی میں ضروری ہے کہ متشابہات قرآنی میں معنی کے لحاظ سے تصرف کیا جائے جس طرح حضرت امیر المومنینؑ نے مذکورہ مورد میں اضلال الٰہی کے معنی میں تصرف کیا ہے۔

اس طرح ایک روایت میں ہم پڑھتے ہیں کہ ایک شخص نے قرآن کی آیات میں تضادات پائے جانے کا دعویٰ کیا تو ان کے بارے میں حضرت علیؑ سے سوال ہوا تو آپؑ نے اُسے جواب دیا جن نکات کی طرف آپؑ نے اشارہ فرمایا ان میں سے ایک سورہ قیامت کی آیت 22 اور 23 کے متعلق تھا جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃٌ "اور سورہ انعام کی آیت 103 "لاتدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار "کے بارے میں تھا اور وہ یہ تھا کہ یہ آیت شریفہ اس مقام سے مربوط ہے جب اولیاء اللہ حساب وکتاب سے فارغ ہو کر ایک نہر جس کا نام "رضوان" پر پہنچیں گے تو اس نہر سے سیراب بھی ہوں گے اور اس میں غسل بھی کریں گے اس کے بعد ان کے چہرے تروتازہ، خوش وخرم اور نورانی ہو جائیں گے اور پانی کے ذریعے ہر قسم کی پلیدی ونجاست بر طرف ہو جائے گی اس موقعہ پر انہیں حکم ہوگا کہ بہشت میں داخل ہو جائیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے ربّ کی طرف متوجہ ہوں گے کہ وہ کس طرح انہیں جزا دیتا ہے:

فمن ھذا المقام ینظرون الی ربھم کیف یثیبھم ومنہ یدخلون الجنَّۃَ فذلك قولُ اللہِ عزّوجلَّ فی تسلیم الملالکۃِ علیھم :"سلامٌ علیکم طبتم فادخلوھا خالدین" (54) فعندلك اَیْقَنُوا بِدخول الجَنَّۃَ والنظرِ الی وعدَھم ربُّھمن فذلك قولہ :اِلیٰ ربّھا ناظرۃٌ "وانّما یعنی بالنظرالیہ النظرُ اِلی ثوابہ وامّاقولہ "لاتدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار "فھو کماقال لاتدرکہ ولاتحیط بہ الاوھام وھویدرك الابصار یعنی یُحیط بھا۔ (55)

24 ۔اور اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد گمراہ نہیں کرتا یہاں تک کہ ان پر یہ واضح کر دے کہ انہیں کن چیزوں سے بچنا ہے۔

اس روایت میں اگرچہ امام علیہ السلام نے واضح انداز سے نہیں فرمایا کہ لفظ "ناظرۃ" متشابہات میں سے ہے اور اسے قرآن کے محکمات کی طرف پلٹانا چاہیئے لیکن واضح ہے کہ تناقص یا تضاد کے ابہام کو دور کرنے کیے لیے آیت محکمہ "لاتدرکہ الابصار" میں آپؑ نے کوئی تصرف نہیں کیا لیکن آیت۔۔۔"الی ربّھاناظرۃ" میں تصرف کیا ہے۔ لفظ ناظرہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک اللہ تعالیٰ کو دیکھنا اور دوسرا رحمت الہی کی طرف دیکھنا یا منتظر ہونا، آپؑ نے آیت کا دوسرا معنی اخذ کیا ہے۔

بہر صورت قرآن اور احادیث دونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے محکمات و متشابہات پر توجہ کیے بغیر، مکتب اہلبیت سے متشابہات کی تاویل میں الہام لیے بغیر اور محکمات کی طرف انہیں پلٹائے بغیر تفسیر کرنا تفسیر بالرائے کے واضح ترین مصادیق میں سے ہے۔(جو کہ تفسیر بالرائے کی گفتگو میں بعض مربوط روایات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے)اور اِسی زوایہ نگاہ سے امام صادق علیہ السلام نے صوفیوں کے ساتھ بحث میں تین مرتبہ ناسخ و منسوخ اور محکم و متشابہ کے مسئلہ کو ذکر کیا ہے اور ان کی سرزنش فرمائی کہ وہ قرآن کی ان خصوصیات کا علم حاصل کیے بغیر کس طرح قرآن کی تفسیر کرتے ہیں؟(56)

٦۔قرآن میں مختلف وجوہ اور نظایر سے غفلت

قرآن میں ایسے کلمات اور الفاظ موجود ہیں جو کئی طرح سے استعمال ہوئے ہیں لہٰذا آیات قرآنی کو سمجھنے کی خواہش رکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ غور وفکر کرکے ایک لفظ کے لیے جتنے متعدد معانی ممکن ہو سکتے ہیں انہیں مد نظر رکھے علامہ سیوطی نے اپنی کتاب "الاتقان" میں "وجوہ" کی متعدد مثالیں ذکر کی ہیں ان میں سے ایک لفظ "رحمت" ہے جو متعدد موارد میں استعمال ہوا ہے جیسے اسلام ،ایمان، بہشت، بارش، نعمت نبوت،قرآن، رزق، فتح وکامیابی، عافیت، مودّت،امور میں گشادگی، مغفرت اور حفاظت ونگہداری۔ (57) اس بناء پر الفاظ کے گوناگوں معانی سے غفلت فہم قرآن کے لیے بڑی مشکل ہے اس لیے اہلبیت علیہم السلام نے اس طرف توجہ دلائی ہے تاکہ اس چیز سے غفلت کا ارتکاب نہ ہو۔

مثال کے طور پر حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے ابن عباس کو خوارج کے پاس بھیجا تاکہ ان سے بحث اور مذکرات کرے۔ابن عباس نے عرض کیا یاامیرالمومنین !کتاب الٰہی کے متعلق میں ان سے زیادہ جانتا ہوں کیونکہ قرآن ہمارے گھروں میں آیا ہے۔آپؑ نے جواب دیا تم ٹھیک کہتے ہو لیکن قرآن کی تأویل اور مختلف وجوہ ہیں، تمہاری ایک بات ہے ان کے پاس بھی نکات ہیں۔تم ان سے سنت کے ذریعے مناظرہ اور بحث کرو اس صورت میں ان کے لیے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوگا ابن عباس نے ایسا ہی کیا یہاں پر ان کے لیے کوئی حیل وحجت باقی نہیں رہی تھی۔(58) نہج البلاغہ میں بھی یہی بات ذکر ہوئی ہے۔فرمایا:

"لاتُخاصِمُهم بالقرآن فانَّ القرآنَ حمّالٌ ذووجوهتقولُ ويقولون ولكن حاججهم (خاصمهم)بِالسُّنّةِ فانَّهم لن تجدوا عنها معيصاً" (59)

اس موضوع پر رسول اکرم ﷺ کا فرمان توجہ کا قابل ہے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے "القرآن ذَلولٌ ذووجوه فاحملوه على احْسنِ الوجوه" (60)قرآن ایک سواری اور متعدد صورتیں رکھتا ہے(یعنی ہر طرح سے اس کا معنی کیا جاسکتا ہے) پس اُسے بہترین وجہ پر حمل کرو(یعنی بہترین معنی کرو)

"نظایر "ان کلمات اور الفاظ کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے جن کے معانی ایک دوسرے سے نزدیک اور تقریباً مترادف ہوتے ہیں۔ "نظایر مترادف الفاظ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہے جب چند الفاظ (کلمے یا جملے) تقریباً ایک معنی دے رہے ہوں اور انہیں الگ الگ کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں دونوں چیزیں (وجوہ اور نظایر) کثرت سے پائی جاتی ہیں اس لیے وجوہ اور نظایر کی پہچان ایک تفسیری ضرورت ہے۔" (61)

تفسیر مجمع البیان کی ایک خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ طبرسی مرحوم الفاظ کی قربتوں اور معانی کے نظایر کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں: "التوبة والاقلاع والانابة فی اللغة نظایر" (62) یا بیان کرتے ہیں: "الثمن والحوض والبدلُ نظائر" (63) اور (64)

پس جو قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اُسے چاہیے کہ وہ وجوہ اور نظایر کے حوالے سے کافی معلومات حاصل کرے ورنہ آیات الٰہی کے بارے میں اس کی تفسیر صحیح تفسیر نہیں ہوگی۔

۷۔ سیاق آیات سے غفلت

سیاق کلام کے پیوستہ قرائن میں سے ہے جس کی طرف توجہ کیے بغیر متکلم کے الفاظ سے اس کا معنی اور مراد نہیں سمجھا جاسکتا۔ سیاق الفاظ، یا عبارت یا ایک گفتگو کی ایک قسم کی خصوصیت ہے جو کلمات اور جملات کے ایک دوسرے کے ساتھ ہونے سے وجوہ میں آتی ہے۔ مثال کے طور پر جب "اِذهب اِلیٰ الجز" کا جملہ اہتمام کے ساتھ "واستمع حدیثه" کے جملے کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس میں ایک خصوصیت اور خوبی پیدا ہوتی ہے جو ان کے الگ الگ ادا کرنے سے وجود میں نہیں آتی۔ اِس دلیل کی بناء پر جب دوسرے جملے کے ساتھ ہو تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ "عالم کے پاس جاؤ" اور جب پہلا جملہ اکیلا ہو تو ظاہری معنی یہی ہے کہ "سمندر کی طرف جاؤ"۔ (65)

اگر ہم اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں غور و فکر کریں تو دیکھیں گے کہ "سیاق" کا مسئلہ اچھی طرح بیان ہوا ہے۔ مثلاً عباد بصری نامی ایک شخص مکہ کے راستے میں امام سجاد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے کہا: کیا آپؑ نے جہاد اور اس کی سختی کو چھوڑ کر حج اور آسانی کو اختیار کیا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ اللّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّهِ فَاسْتَبْشِرُواْ بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (توبہ: 111) [25]

جب اس کی بات ختم ہوئی تو امام علیہ السلام نے اس سے فرمایا: آیت کو پورا پڑھو (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد) فرمایا ہے:

التَّائِبُونَ الْعَابِدُونَ الْحَامِدُونَ السَّائِحُونَ الرَّاكِعُونَ السَّاجِدونَ الْآمِرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّاهُونَ عَنِ الْمُنكَرِ وَالْحَافِظُونَ لِحُدُودِ اللّهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ" (توبہ "112) [26]

پھر آپؑ نے فرمایا: "اذا رأينا هولاءِ الّذين هذهِ صفتهم فالجهاد معهم افضل من الحج" (66) یعنی جب اس قسم کی صفات (آیت میں موجود) کے حامل افراد کو دیکھیں گے تو ان کے ساتھ جہاد حج سے افضل ہے۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا اس روایت کے مطابق امام علیہ السلام عباد بصری کو تاکید فرماتے ہیں کہ آیت کے باقی حصے کو مکمل کرتے ہوئے اس کے سیاق کو مد نظر رکھ کر بات کرو، نہ یہ کہ آیت کو آگے پیچھے سے کاٹ کر مطلب بیان کرو۔ پس آیات کے سیاق اور کلام سے مربوط قرائن سے عدم توجہ آیات کے معانی کو سمجھنے میں ایک اور مانع اور مشکل ہے۔ (67)

25 ۔ یقیناً اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے عوض خرید لیے ہیں، وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں، یہ توریت انجیل اور قرآن میں ان کے ذمے پکا وعدہ ہے اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ پس تم نے اللہ سے ساتھ جو سودا کیا ہے اس پر خوشی مناؤ اور یہ تو بہت بڑی کامیابی ہے۔

26 ۔ (یہ لوگ) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، ثنا کرنے والے، (راہ خدا میں) سفر کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کی دعوت دینے والے اور برائی سے روکنے والے اور حدود اللہ کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (اے رسول) مومنین کو خوشخبری سنا دیجیے۔

۸۔اسباب النزول سے غفلت

رسول اللہ ﷺ کے دور میں کبھی کوئی واقعہ رونما ہوتا یا لوگ سوال پیش کرتے اور اس کے جواب کی درخواست کرتے تو یہ امر سبب بنتا اور اللہ تعالیٰ آیت یا آیات نازل فرما کر حکم بیان فرماتا یا صورتحال کو واضح کر دیتا یا سوال کو جواب عطا فرما دیتا تھا۔ اسی طرح کے امور کو جو آیات کے نزول کا موجب بنتے تھے۔ انہیں سبب نزول کہتے ہیں۔ آیات کے اسباب النزول اور لوگوں سے خطابات الٰہی کے زمان و مکان کی طرف توجہ آیات کے مقصود اور معنی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے مثلاً امام صادق علیہ السلام کے مطابق سورہ دھر کی آیات کا سبب نزول اہلبیت علیہم السلام اور ان کی خادمہ فضّہ کے یتیم، مسکین اور اسیر پر انفاق تھا۔(68)

اسی طرح ایک اور روایت میں دیکھتے ہیں کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے آیت شریفہ "إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُواْ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلاَةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ" (مائدہ: 55)[27] کا سبب نزول حضرت علی علیہ السلام کا حالت رکوع میں زکوۃ ادا کرنا بیان فرماتے ہیں۔(69)

تیسری روایت میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب جنگ احد کے اختتام پر آنحضرت ﷺ نے حضرت حمزہ (علیہ السلام) کے مثلہ شدہ جنازے کو دیکھا تو فرمایا: "اگر میں ان (مشرکین) پر غالب آگیا تو میں ضرور ان کا مثلہ کروں گا اور ضرور مثلہ کروں گا"۔ اس موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

"وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُواْ بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ" (نحل: 126)[28]

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا "اَصبرُ اصبرُ" (70) میں صبر کروں گا میں صبر کروں گا۔

پس اسباب نزول سے عدم توجہ فہم القرآن میں ایک اور مانع اور مشکل ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فہم القرآن میں اہلبیت علیہ السلام کی نظر میں فقط مذکورہ مشکلات اور خطرات نہیں ہیں بلکہ روایات میں

---

27 ۔ تمہارا ولی تو صرف اللہ اور اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔

28 ۔ اور اگر تم بدلہ لینا چاہو تو اسی قدر بدلہ لو جس قدر تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اگر تم نے صبر کیا تو یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے۔

تحقیق اور غفور و فکر سے دیگر مواقع اور مشکلات بھی تلاش کی جاسکتی ہیں ہم نے صرف اہم ترین کا ذکر کیا ہے۔

حوالہ جات

1 ۔ نهج البلاغه، ترجمه دشتی، خطبه 125

2 ۔شیخ عباس قمی، مفاتیح الجنان، زیارت «جامعه کبیره

3 ۔برگرفته از روایت امام علی(علیه السلام)، ر.ك: عبدعلی بن جمعه العروسی الحویزی، نورالثقلین، مطبعة العلمیه، قم، ج 1، ص 313.

4 ۔ابن منظور الافریقی، لسان العرب، بیروت، دار الفکر، ج14، ص300.

5 ۔سیدعلی کمالی دزفولی، شناخت قرآن، تهران، وزارت فرهنگ و ارشاد اسلامی، 1369، ص 311 .

6 ۔مصطفی عبدالله مشهور به «حاجی خلیفه کاتب حلبی»، کشف الظنون، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ج 1، ص 434.

7 ۔الفیض الکاشانی، تفسیر الصافی، بیروت، مؤسسة الاعلمی للمطبوعات، ج 1، ص 36.

8 ۔ ر.ك: محمدحسین طباطبائی، المیزان، قم، منشورات جامعة المدرسین، ج 3، ص 80.76.

9 ۔ ر.ك: محمدحسین طباطبائی، المیزان، قم، منشورات جامعة المدرسین، ج3، ص 80.76

10 ۔ نہج البلاغہ، خطبہ 18.

11 ۔ ہمان، خطبہ 133

12 ۔ ہمان، خطبہ 133

13 ۔عیّاشی، تفسیر العیاشی، المکتبة العلمیه الاسلامیه، ج1، ص 319، حدیث 109.

14 ۔عبدالله جوادی آملی، تفسیر موضوعی قرآن در قرآن، قم، اسرا، 1378، ج 1، ص 395.

15 ۔شیخ صدوق، الامالی، چ چهارم، اسلامیه، 1362، مجلس دوم، حدیث سوم.

16 ۔ نہج البلاغہ، خطبہ 147 / خطبہ 141.

17 ۔ نہج البلاغہ، خطبہ 147 / خطبہ 141.

18 ۔ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، ج 93، ص 12.

19 ۔ برای آگاهی بیش تراز مسأله تفسیربه رأی، ر.ك: محمدهادی معرفت، التفسیر المفسرون، مشهد، الجامعة الرضویة للعلوم الاسلامیة، ج 2 / روش شناسی تفسیرقرآن، زیرنظرمحمود رجبی، ص 57 .

20 ۔ شیخ حرّ عاملی، وسائل الشیعه، بیروت، مؤسسة آل البیت لاحیاء التراث، ج 27، ص 183، حدیث 25.

21 ۔ الفیض الکاشانی، همان، ج 1، ص 71.

22 ۔ محمد حسین طباطبائی، همان، ج 3، ص 83.

23 ۔ السید هاشم البحرانی، البرهان فی تفسیر القرآن، بیروت، مؤسسة الاعلمی للمطبوعات، ج 1، ص 34.24.

24 ۔ محمد حسین طباطبائی، ج 1، ص 24.

25 ۔ العیاشی، همان، ج 1، ص 244.

26 ۔ الشیخ الطوسی، التبیان فی تفسیرالقرآن، مکتب الاعلام الاسلامی، 1409، ج 1، ص 5.

27 ۔ محمدحسین طباطبائی، قرآن در اسلام، قم، انتشارات اسلامی، 1361، ص 70

28 ۔ ر.ك: ابوالقاسم خوئی، البیان فی تفسیرالقرآن، چ سوم، قم، دار الثقلین، 1418، ص 398.

29 ۔ شیخ حر عاملی، همان، ص 192، حدیث 41.

30 ۔ سید محمدحسین فضل الله، من وحی القرآن، بیروت، دار الملاك، ج 1، ص 14

31 ۔ محمد باقر مجلسی، همان، ج 47، ص 338، حدیث 16

32 ۔ الحویزی، همان، ج 1، ص 21، حدیث 90.

33 ۔ ر.ك: علی اکبربابایی، مکاتب تفسیری، ص 134

34 ۔ محمد حسین طباطبائی، همان، ص 50.

35 ۔ الفیض الکاشانی، ج 1، ص 54 / عیاشی، همان، ج 1، ص 10

36 ۔ العیاشی، همان، ص 11.

37 ۔ ر.ك: الحویزی، همان، ج 2، ص 280.281.

38۔السیدھاشم البحرانی،ھمان،ج6،ص526/محمدبن یعقوب الکلینی،اصول الکافی،بیروت، دارالتعارف، 1411،ج1،ص269

39 ۔آل عمران: 7/اعراف: 53/یونس: 39.

40 ۔عیاشی، ہمان، ص14و17.

41 ۔محمد حسین طباطبائی، ہمان، ص45.

42 ۔الحویزی، ھمان، ج1، ص 315.

43 ۔شیخ حر عاملی، ہمان، ص198، حدیث53.

44 ۔ہمان، ص207، حدیث63.

45 ۔عبداللہ جوادی آملی، ہمان، ص372.

46 ۔شیخ حر عاملی، ہمان، ص183، حدیث23.

47 ۔برای مطالعه بیش تر ر.ك: السید ابوالقاسم الخوئی، ھمان، ص 275 . 276.

48 ۔ابواسحاق الامام الثعلبی، تفسیر الثعلبی، بیروت، داراحیاءالتراث العربی، 1422،ج 9،ص 261.

49 ۔ابواسحاق الامام الثعلبی، ھمان، و نیزابوجعفر محمدبن جریرالطبری، جامع البیان(تفسیر الطبری)، چ سوم، بیروت، دارالکتب الاسلامیة، 1420،ج 12،ص 20.

50 ۔برای مطالعه بیش تر ر.ك: السید ابوالقاسم الخوئی، ھمان، ص376

51 ۔ر.ك: محمدھادی معرفت، التمهید، چ سوم، مؤسسة النشر الاسلامی، 1416،ص 274 . 298 / السید ابوالقاسم الخوئی، ھمان، ص 275 . 380.

52 ۔محمد حسین طباطبائی، ہمان، ص 34/ص 37

53 ۔ محمد حسین طباطبائی، ہمان، ص 34/ص 37

54 ۔ھمان، ص 38 به نقل از عیون اخبار الرضا، ج 1، ص 29.

55 ۔محمد باقر مجلسی، ہمان، ج93، ص12.

56 ۔محمد باقر مجلسی، ہمان، ج17، ص119

57 ۔شیخ حر عاملی، ہمان، ص183، حدیث23.

58 ۔جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، الاتقان، نشر شریف رضی، ج 2،ص 149 / ص 149.

59 ۔جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، الاتقان، نشر شریف رضی، ج 2،ص 149 / ص 149.

60 ۔ نہج البلاغہ، نامہ 77.

61 ۔الفیض الکاشانی، ہمان، مقدمہ پنجم، ص 36.

62 ۔محمد ہادی معرفت، علوم قرآن، قم، مؤسسہ انتشارات التمہید، 1378،ص 121.

63 ۔ابوعلی الفضل بن الحسن الطبرسی، مجمع البیان، تہران، مکتبۃ العلمیۃ الاسلامیۃ، ج 1،ص 88.

64 ۔ہمان، ص 94 و نیز ر.ک: الدکتور ناصر کاظم السراجی، الطبرسی و منہجہ فی التفسیر اللغوی، بیروت، دارالاضوا، ص 254. 270.

65 ۔روش شناسی تفسیر قرآن، ص 120.

66 ۔الحویزی، ہمان، ج 2،ص 272 / محمد باقر مجلسی، مرآۃ العقول، ج 18،ص 347.

67 ۔برای مطالعہ بیشتر ر.ک: ہمان، ج 1،ص 102 بہ بعد.

68 ۔الحویزی، ہمان، ج 5،ص 474.

69 ۔الحویزی، ہمان، ج 1،ص 646.

70 ۔ہمان، ج 3، ص 96.

DANGER AND DIFFICULTIES IN UNDERSTANDING THE QURAN IN THE VIEW OF AHL AL BAIT (A.S)

By: ***Ali Muhammad Qasmi***

Key Words: *T Ahl al Bait, Understanding Quran, Tafseer bil ra'I, Well-grounded in knowledge (rasikhoon al ilm), Allama Tabatabi, faiz Kashani, Charectaristics of the Qura.*

Abstract:

It has no doubt that everyone can understand the holy verses, although with different levels of comprehending and difficulties. With the exception of those who are well-grounded in knowledge (Ahl al Bait), no van can understand Quran in depth and interpret it fully. Through many Ahadith, the members of the holy family of Muhammad (PBUH) have encouraged us to get in touch with Quran. They have warn people about Tafseer bil ra'I and have highlighted the difficulties and danger in the way of understanding Quran so that people can neither misunderstood it nor distract other. In this article an attempt has been made to mention the dangers of tafseer bil ra'I in accordance with the teachings of Ahl al Bait.

The Necessity and Importance of Studying the Lifestyle of the Holy Prophet in Contemporary Era

By: ***Roshan Ali***
roshanali007@yahoo.com

Key Words*: Government, imam, Wa'ali (governor), oulil Amr, Ruler, al Qaiyyem, Subjects, Muslim community.*

Abstract:

Unlike other issues, the issue of government has been treated in a unique way in Nah al Balagha. Imam Ali (a.s) has not only presented the issue theoretically but he also experienced it. In this article the views of Imam Ali about government has been forwarded that are cited in nah al Balagha. Those words and terminologies that have been used for government, ruler, and ruled by the imam also have been mentioned in this article with reference to different sermons. Imam Ali has mentioned the duties of imam, waali (governor), and wali amr. He has pointed out the reciprocal rights of both the ruler and ruled. He has rejected the fallacy of kharijites and has made it clear that the right to rule exclusively belongs to Allah, but a ruler is inevitable to implement His rules. He has then described the duties of ruler and has suggested him to live his life like the poor do. He has termed government both a right and a duty.

The Basic Principles of Divine Economics (2)

By: ***Dr. Sheikh Muhammad Hasnain***
sheikh.hasnain26060@gmail.com

Key Words: *Theology, economics, human values, exploitation, national production, social justice, standard manufactures goods, accumulation, loan.*

Abstract:

Economics is of utmost significance in theology because of the role it plays in bringing humanity to higher human values. According to theology, neither a person nor a society can be considered developed unless it is ruled by higher human values. Providing equal economic opportunities, equal distribution of basic facilities and national production, and narrowing down the gap between rich and poor by providing religious alms are some of important ways to social justice. Likewise, providing standard manufacture goods are another important principle of the divine economics. The more a production unit's goods are higher qualitatively, the more its owner and workers are holders of high human characteristics. Furthermore, divine economics suggests that a person must prefer his country-made goods over foreign ones for the sake of his country's progress and integrity. One must protect his capital and take benefit from it. Islam criticizes accumulation of wealth and appreciates granting loans so that capital can be in movement and grow by itself.

A CRITICAL OVERVIEW OF THE NARRATIVES REGARDING THE SUCKLING OF THE PROPHET (PBUH)

*By:**Dr. Syed Haider Abbas Zaidi Wasti***
dr.sha_wasti@yahoo.com

***Key Words**: Life of the Prophet, Hazrat Amina, Hamza bin Abul Muttalib, Haleema Saeeda, Sobia Aslamia, Abu Lahb, Abu Sufyan.*

Abstract:

According to the books of Sirah, the Prophet has suckled (breastfed) many women, beside his mother, whose being monotheists is not proved. Some people have rejected such narratives and have insisted that he only had suckled his mother. Therefore, there are two views regarding the issue; one asserts that the Prophet had suckled many women beside his mother, while the other claims that he had only suckled his mother. Both the views have been critically examined in this article. In first place, those narratives have been discussed that are related to the former view. In second place, arguments from Quran, history, and rationale in favorer of the later view. We have mentioned those narrative regarding the suckling of the prophet that had been presented by the historian Muhammad bin Ishaq, d151 hijrah, in order to highlight the contradiction that is found those narratives. According to Quran mother have to suckle their infants for two whole years, if they wish so. In the presence of such a verse it seems absurd from the part of historian to insist on the suckling of the Prophet by other women, instead of his mother's being alive till the end of the suckling period i.e. two complete years. According to Quran, Allah had preferred the suckling of prophets by their own mothers. History does not has any example that can illustrate that Allah has deprived any prophet from the suckling of his mother. The example of hazray Mosa is so vivid in this regard. It is, therefore, proved that the Prophet had only suckled his mother.

PEACE AND AMITY

By: ***Syed Abbas Haider Zaidi***
abbaspsc@yahoo.com

Key Words*: Jihadist culture, Gazawah, siriyyah, Life of the Prophet, Migration, separation amongst the Sahabah.*

Abstract:

In current era, anti-Islam elements consider the battles fought by the Prophet (PBUH) as the root cause of the jihadist culture, promoted by some of the so-called Muslims. For them, Quran and the tradition (Sunnah) have bolstered the jihadist culture. But, this view is far from reality because Allah has termed the prophet as the mercy for both the two worlds and has send him as the messenger of peace and amity. One can find his life full of mercy, forgiveness, peace, and amity. He brought about peace in such a society in which bloodshed was so prevalent. As for as his battles are concerned, they were defensive in nature. During Mecca period, he did not fight any war. When the Prophet came to Medina, polytheists felt threatened and started to wage wars against Muslims. The Prophet did not abandon the principle of justice in those wars. The life of Holy Prophet teach us that we must consider all Muslims as our brothers, even we should respect the people of Book. We should boycott those Muslims who consider others as unbelievers and legitimize their killing.

THE BELIEF OF REVERSION (RAJA'T)
(IN THE LIGHT OF QURAN AND THE TRADITION)

By: ***Syed Aqeel Haider Zaidi***
dr.sahawasti@yahoo.com

Key Words*: Reversion, returning (kar'rah), Dabbatullah, Days of Allah, sincere believers, Revelation of Imam Mahdi, reincarnation/transmigration.*

Abstract:

The belief of reversion is one of the pillars of Shia school of Islamic thought that has been a contested phenomenon for long. An attempt has been made in this article to argue in favor of its possibility and certainty on the basis of religious teachings and wisdom. The meaning and origin of Raja't, its genealogy, the questions that stem from it, and historical proofs and evidences have been utilized, in this article, to prove that reversion is possible. The focal point of this article is those quranic verses and their interpretation that indicate the occurrence of Raja't as well as the Ahadith that narrate the belief independently. At the end of this article, many questions and doubts about the issue have been responded and it has critically examined that wether this belief is contradictory with Quran or Ahadith or whether it is a self-constructed fantasy of Abdullah ibn-e-Saba.

DISJOINTED LETTERS:

AN ANALYTICAL STUDY OF DIFFERENT VIEWS

By: ***Saqib Akbar***
ukhuwat@gmail.com

Key Words*: Challenge, Shan-enozool, Motashabiha'at (allegorical verses), companions of the holy Prophet.*

Abstract:

Some chapters of the holy Quran begin with disjointed letters (huroof al muqatta'at) that do not form any clear word and have to be recited separately. These disjointed letters are made of one, two, three, four, or five letters/ alphabets. Quran is the only divine book that has such disjointed letters. Many attempts have been made, throughout the history, to make meaningful sentences from the disjointed letters and many have interpreted them according to their understanding and school of thought. There are many views regarding the disjointed letters. Firstly, these letters are like mutashabiha'at verses (meanings of which are not clear).secondly, these letters are names of the chapters (Surahs). Thirdly, these letters are the name of the whole Quran. Fourthly, these letters indicate that rationale is the primordial creature. Fifthly, these letters contain messages to the holy Prophet (PBUH). Lastly, these letters are stand for the challenge (tahaddi).

SOLITARY OF THE QURAN

By: Syed Ramiz ul Hassan
Srhm2000@yahoo.com

Key Words: *Solitude, cruelty, Jamal al Din, Khomeini, Quranic terminologies, Saqalain, Secularism*.

Abstract:
Zaidai By looking at the literal meaning of Hijrah (migration) interpreters of the holy Quran have defined mahjoriat (solitary) as leaving Quran after accepting it. Quran has drawn our attention toward mahjoreat through the words of holy Prophet (PBUH). Imam Ali (a.s) has also mourn on the solitary of the Quran as if he was witnessing it in the later ages. Muslim thinkers, in every era, have also mentioned this solitary and termed it as the cause of the downfall of the Muslim community, the Ummah.
Historically speaking, Syed Jamal al Din has presented the solitary of Quran in clear ways and has tried to awaken the Ummah in this regard. After him, Imam Khomeini, in the beginning of the 14th century, brought the solitary of Quran into the fore through his writings and speeches during his revolutionary movement. He attempted to bring Quran out of the centuries-long solitude. He laid down the Islamic revolution's academic basis on Quran. He is, therefore, the only person who attempted seriously to move in the direction of the Quran. The fruits of his struggle can be seen now academically as well as practically. The Islamic revolution revived many Quranic terminologies and concepts. In this article, an attempt has been made to gather his views regarding Quran.

عید الضحیٰ کے دن کی دعا

اللَّهُمَّ هَذَا يَوْمٌ مُبَارَكٌ مَيْمُونٌ وَ الْمُسْلِمُونَ فِيهِ مُجْتَمِعُونَ فِي أَقْطَارِ أَرْضِكَ يَشْهَدُ السَّائِلُ مِنْهُمْ وَ الطَّالِبُ وَ الرَّاغِبُ وَ الرَّاهِبُ وَ أَنْتَ النَّاظِرُ فِي حَوَائِجِهِمْ فَأَسْأَلُكَ بِجُودِكَ وَ كَرَمِكَ وَ هَوَانِ مَا سَأَلْتُكَ عَلَيْكَ أَنْ تُصَلِّيَ عَلَى مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ وَ شْرِكْنَا فِي صَالِحِ مَنْ دَعَاكَ فِي هَذَا الْيَوْمِ مِنْ عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ وَ أَنْ تَغْفِرَ لَنَا وَ لَهُمْ إِنَّكَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

بارالہا! یہ بابرکت اور باسعادت دن ہے جس میں مسلمان تیری زمین کے ہر گوشہ میں جمع ہیں۔ اُن میں سائل، اُمیدوار اور خوفزدہ، سب تیری بارگاہ میں حاضر ہیں اور تو ہی ان کی حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔ لہٰذا میں تیرے جُود و کرم کو دیکھتے ہوئے، تجھ سے اپنی قلیل حاجت طلب کرتا ہوں تو محمد وآلِ محمد پر درود بھیج اور ہمیں اپنے مؤمن بندوں کی نیک دعاؤں میں شریک فرمااور ہماری اور اُن کی مغفرت فرما! بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(صحیفہ سجادیہ، عید الاضحیٰ کے دن کی دعا سے اقتباس)

توشہ آخرت

وَ اجْعَلْ تَقْوَاكَ مِنَ الدُّنْيَا زَادِي، وَإِلَى رَحْمَتِكَ رِحْلَتِي، وَفِي مَرْضَاتِكَ مَدْخَلِي، وَ اجْعَلْ فِي جَنَّتِكَ مَثْوَايَ، وَ هَبْ لِي قُوَّةً أَحْتَمِلُ بِهَا جَمِيعَ مَرْضَاتِكَ، وَ اجْعَلْ فِرَارِي إِلَيْكَ، وَ رَغْبَتِي فِيمَا عِنْدَكَ، وَ أَلْبِسْ قَلْبِيَ الْوَحْشَةَ مِنْ شِرَارِ خَلْقِكَ، وَهَبْ لِيَ الْأُنْسَ بِكَ وَ بِأَوْلِيَائِكَ وَ أَهْلِ طَاعَتِكَ...

(پروردگار!) پرہیزگاری کو میرا (آخرت کا) توشہ، اپنی رحمت کی جانب میرا سفر، اپنی خوشنودیوں کی جانب میرا گزر اور اپنی جنت میں میری منزل قرار دے اور مجھے ایسی قوت عطا فرما جس سے میں تیری رضامندیوں کا بوجھ اٹھاسکوں۔ اور میرا گریز اپنی جانب اور میری خواہش اپنے ہاں قرار دے اور میرے دل کو اپنی بُری مخلوق (کی محفل) سے وحشت اور اپنی، اپنے دوستوں اور فرمانبرداروں (کی محفل) سے مانوس فرما!...

(صحیفہ سجادیہ کی اکیسویں دعا سے اقتباس)

ISSN2221-1659

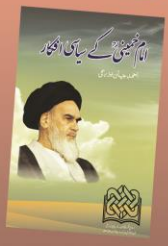

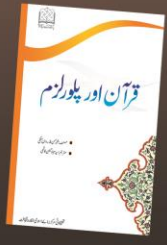

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

خوبصورت الفاظ خود سحر اور جادو کا اثر رکھتے ہیں۔ یہ سننے والے کو نہیں، بلکہ بولنے والے کو بھی لطف اندوز کرتے ہیں۔ مقفیٰ نثر، مترنّم اشعار، فقرے بازی، نکتہ سنجی، چٹکلے اور طرح طرح کی عبارت آرائی، ایک ایسا نشہ ہے جس کی عادت پڑ جائے تو مشکل سے جان چھوٹتی ہے۔ ایسے میں ہر خطیب کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خوبصورت الفاظ تلاش کیے جائیں، خواہ معانی جیسے بھی ہوں۔ لہٰذا معنیٰ اور موضوع کی صحت اور اہمیت کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الفاظ کا حُسن اور خطابت کا زور، علم و معرفت کے بیان پر غالب آ جاتا ہے اور قوم پر ایک طویل سرور اور نشے کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتحال میں خطابت افیون بن جاتی ہے اور اِس افیون کا نشہ بعض اوقات تو صدیوں تک باقی رہتا ہے۔

بدقسمتی سے اِس وقت ہماری قوم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہے۔ یہ قوم الفاظ کے حسن، لفاظی کے نشے اور خطابت کے جادو سے کچھ ایسی سحر زدہ ہے کہ اب علمی گفتگو اور معرفت افزا موضوعات پر تقریر اِس قوم کے ہر چھوٹے بڑے کو بُری لگتی ہے..... حضرت امام حسین علیہ السلام نجات کا سفینہ ہیں اور آپؑ کا ذکر انسانیت کی فلاح کا ذریعہ ہے۔ لیکن جب اسے لفاظی، مقفیٰ عبارتوں، دھواں دھار تقریروں، چٹکلوں اور فقرے بازیوں کی نذر کر دیا جائے تو یہ بھی سُننے والوں کو غفلت کی نیند سُلا دیتا ہے۔

"نمت" (نورالہدیٰ مرکز تحقیقات)

نورالہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937

www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk